Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1984

اس پرچہ میں

(۱) عورت کے خون کی قیمت

(۲) جرائم کسطرح ختم ہوسکتے ہیں

(۳) انتخابات

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ۔لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون:- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان/۴۸ روپے غیر ممالک/۹۸ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۷	مئی ۱۹۸۴ء	شمارہ ۵

فہرست

۱۔ لمعات۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ ——— ۲

۲۔ تبویب القرآن ——— ۸

۳۔ باب المراسلات ——— ۹

(۱) جرائم کا انسداد کیسے ہو سکتا ہے۔ (۲) انتخابات

(۳) (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) (۴) قتل عمد میں دیت

(۵) عورت کے خون کی قیمت (۶) طرزِ حکومت

۴۔ اب اقبالؒ یہ رہ گیا ہے! ——— ۲۷

۵۔ ایک ناقابلِ برداشت صدمہ ——— ۳۲

۶۔ خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر ——— ۳۳

(پرویز صاحب کا یومِ اقبالؒ کا درس)

۷۔ صدرِ مملکت کی تقریر ——— ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالمجید۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس لیک روڈ لاہور

بیادِ اقبالؒ

لمعات

قرآنِ کریم ایک ایسے عالمگیر انقلاب کا پیامبر تھا جس کی نظیر تاریخ انسانیت میں کہیں نہیں ملتی۔ اس نے اس انقلاب کا منشور ان چار (زلزلہ انگیز اور حقیقت کشا) الفاظ میں پیش کیا کہ ـــــ لا الہ الا اللہ۔ الٰہ کے معنی ہیں صاحبِ اقتدار۔ حکمران۔ اتھارٹی۔ جس کی حکومیت اختیار کی جائے۔ اس انقلاب آفریں اعلان نے انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیا۔ اس نے کہا کہ کسی انسان کو حقِ حکمرانی حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کی حکمرانی میں، سیاسی حکمرانی، مذہبی حکمرانی، اور اقتصادی حکمرانی سب شامل ہیں۔ اس سے ملوکیت (شاہنشاہیت۔ آمریت۔ ڈکٹیٹرشپ) مذہبی پیشوائیت کی سیادت۔ و قیادت اور نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد، ملوکیت از سرِ نو زندہ ہوئی تو اس نے اپنے مدِ مقابل، سب سے بڑا حریف، قرآن مجید کو پایا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اس لئے اسے محو کرنا ناممکن تھا۔ اس مشکل کا حل، مذہبی پیشوائیت نے پیش کر دیا۔ اس نے قرآن کے الفاظ تو ویسے کے ویسے رہنے دیئے لیکن ان کا مفہوم بدل دیا۔ (چنانچہ) اس تبدیلی (تحریف معنوی) کی رو سے، الٰہ کے معنی قرار پائے "وہ جس کی پرستش کی جائے"۔ اور لا الہ الا اللہ کے معنی "خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں"۔ اس سے خدا کی خدائی تو ختم ہو گئی اور اس کی جگہ، حکمرانوں، مذہبی پیشواؤں اور نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کی خدائی قائم ہو گئی۔ اور اس کا نام اسلام قرار پا گیا۔

ہزار برس سے یہی اسلام رائج چلا آ رہا ہے۔ اس دوران میں، کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں۔ متعدد حکومتیں آئیں اور چلی گئیں۔ لیکن مذہبی پیشواؤں کا اقتدار بدستور قائم رہا، تا آنکہ علامہ اقبالؒ نے الٰہ کے قرآنی اور مذہبی مفہوم میں فرق کر کے بتایا کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، داعیانِ پاکستان اور اس کے مخالف علماء کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہی، لا الہ الا اللہ کا مفہوم مطلوب تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں"۔ اور داعیانِ پاکستان کہتے تھے کہ اس کا مطلب ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)

یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں، مسلمانوں کو "خدا کی پرستش" کی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے معتقدات میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ شعائر و ارکانِ اسلام کی ادائیگی پوری آزادی سے کر سکیں گے۔ اِن کے شخصی معاملات ان کے فقہی قوانین کی رُو سے طے پائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی کا نام اسلام ہے۔ لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا یہی مطلب ہے۔ اور اس کے لیے مسلمانوں کو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔

ہم ان سے کہتے تھے کہ اِلٰہ کے معنی پرستیدہ (جس کی پرستش کی جائے) اور عبادت کے معنی پرستش نہیں۔ اِلٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار یا حکمران کے ہیں، اور عبادت کا مفہوم ہے محکومیت۔ اس اعتبار سے لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اور عبادت سے مراد ہے خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ خدا کی حکمرانی کا عملی ذریعہ اُس کی کتاب (قرآنِ مجید) کی حکومت ہے اور اسلام سے مراد ہے قرآنِ مجید کی حکمرانی۔ اس اسلام کی اجازت کوئی مملکت بھی نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کسی غیر مسلم مملکت میں اس کا امکان ہے۔ کتاب اللہ کی رُو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ انسانوں کی حکومت کی کوئی شکل ہو، قرآن کی رُو سے اُس کی اطاعت، غیر اللہ کی اطاعت، فلہذا کفر اور شرک ہے۔ "انسانوں کی حکومت" میں، عہدِ بابِیر کی ملوکیت سے لے کر عصرِ حاضر کی جمہوریت تک، سب شامل ہیں حتیٰ کہ فقہی قوانین کی اطاعت بھی انسانوں کی اطاعت ہے کیونکہ وہ قوانین بھی اُن ماہرینِ قوانین کے وضع کردہ ہیں جو انسان ہی تھے۔ لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا صحیح مطلب قرآنی حکومت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس قسم کی حکومت اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کا یہی تقاضا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ تھا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران حقیقی نزاع، لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کے مطلب کا ہی اختلاف تھا۔ یہ جنگ اول تو انگریز یا ہندو کے خلاف تھی ہی نہیں کیونکہ وہ مذہبی سطح پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور اگر تھی بھی تو اس کی حیثیت ثانوی تھی، بنیادی جنگ، داعیانِ پاکستان اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کے مابین تھی۔ ہندو اگر اس مطالبہ کے خلاف کبھی مذہبی دلیل پیش کرتا تھا تو اس لئے کہ اُس کے مذہب کی رُو سے، مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور یا اس لئے کہ خود مسلمانوں کے علماء یہی دلیل پیش کرتے تھے۔ (مثلاً) مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نزدیک اسلام کا ماحصل "خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی" تھا۔ (یعنی وہی "پرستش" کا تصور)۔ ان کے پیش کردہ اِس تصور کو ہندوؤں نے اپنے اہتمام سے سارے ملک میں عام کیا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلمانوں کی جدا مملکت کا تصور پیش کیا تھا، تو ایسا اچانک یا کسی ہنگامی جذبہ کے تحت نہیں کیا تھا۔ اُن کی ساری عمر "لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ" کا مطلب سمجھانے میں گذر گئی تھی۔ انہوں نے (مثنوی رموزِ بیخودی) میں پہلے یہ بتایا کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت یہ تھی کہ ؎

بُود انسان در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

اِس میں "انسان پرست" کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ اِس میں ہر قسم کی انسانی حکومت آجاتی ہے، یعنی ؎

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش

یہ ملوکیت کی "انسان پرستی" (غلامی اور محکومی) تھی۔ اِس کے ساتھ ؎

کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

یہ تھیاکریسی (یعنی مذہبی پیشواؤں کے فقہی قوانین) کی حکومت تھی۔ ملوکیت اور تھیاکریسی کے گٹھ جوڑ سے حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت باج بر کشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضواں فروش بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

(رموزِ بے خودی ۔ صفحہ ۱۱۹)

غریب و مفلس۔ محنت کش و مزدور۔ مزارع و کاشتکار بیچارے، دونوں ہاتھوں سے لٹتے تھے۔ ایک طرف حکومت اپنے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ دوسری طرف مذہب کے نام پر، ان کا خون نچوڑا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ؎

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ (ایضاً)

نزولِ قرآن کے وقت ۔ ۔ ۔ انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ ایک طرف مستبد حکمرانوں کی ذلت آمیز اور اذیت ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے غضبناک اور قہر آلود بندھنوں میں بندھا ہوا کہ انقلابِ محمدیہ نے (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)) فرعونوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہامانوں کی ان بندشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا۔

تا امینے حق بحق داراں سپرد بندگاں را مسندِ خاقان سپرد

شعلہ از مردہ خاکستر کشاد کوہکن را پایۂ پرویز داد

قوتِ او ہر کہن پیکر شکست نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست

تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید بندہ را باز از خداونداں خرید

(رموزِ بے خودی ۔ صفحہ ۱۱۹ ۔ ۱۲۰)

حضرتِ علامہ نے اس آخری مصرعہ میں قرآن کے انقلابِ عظیم کا ماحصل چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے، جب کہا ہے کہ "بندہ را باز از خداونداں خرید"۔ یعنی انسانوں کو انسانوں کی حکومت سے آزاد کرا دیا ۔۔۔ ۔۔۔ خواہ وہ انسان قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کے نمائندے تھے اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ "خداوند"!

سوال یہ ہے کہ اس انقلابِ عظیم کا نقطۂ ماسکہ یا بنیادی محرک کیا تھا؟ علامہ اقبالؒ نے (قرآنِ کریم کی روشنی اور راہنمائی میں) بتا دیا تھا کہ یہ سب کرشمہ اور اعجاز تھا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کا۔

یہ کلمۂ انقلاب آفریں دو گوشوں پر مشتمل ہے:۔ "لَا إِلٰهَ + إِلَّا اللّٰه"

"لَا إِلٰهَ" ہر انسانی حکمرانی سے انکار، بلکہ اس کے خلاف اعلانِ بغاوت۔ اور "إِلَّا اللّٰه"، کتاب اللہ کی حکومت کا اثبات۔ اقبالؒ کا سارا کلام اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ وہ اپنی دوسری مثنوی "پس چہ باید کرد۔ اے اقوامِ شرق" میں کہتے ہیں۔

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لا است — ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات
بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ — تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے — ایں غوِ رعد است، نے آوازِ نے

(پس چہ باید کرد۔ صـ۱۹)

لا اِلٰہ کو مسلکِ حیات قرار دینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اقبالؒ اسے مردِ حُر (یعنی بندۂ آزاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ مردِ حُر کے متعلق وہ کہتے ہیں :ـــ

مردِ حُر از لا اِلٰہ روشن ضمیر — می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
با کلیسا دوست، نا مسجد فروش — او ز دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش
در جہانِ بے ثبات او را ثبات — مرگ او را از مقاماتِ حیات (ایضاً)

جاوید نامہ میں وہ خود غوِ رعد (بجلی کی کڑک) بن کر یوں غلغلہ انداز ہوتے ہیں :ـــ

لا اِلٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا اِلٰہ گفتار نیست — لا اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است — لا اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۲۳۴)

آپ نے غور فرمایا کہ مصورِ پاکستان نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا مفہوم کس واشگاف انداز میں سمجھایا تھا۔ لا اِلٰہ انسانوں کی ہر حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا، اور وہ اِس جنگ کے مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے انہوں نے (اپنی آخری تحریر ارمغانِ حجاز میں) کہا تھا کہ :ـــ

بنورِ تو بر افروزم نگہ را ! — کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم — کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را ! (ایضاً صث)

اِس سے آپ نے اندازہ فرما لیا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ

پاکستان کا مطلب کیا ـــــ لا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تو اِس میں، لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کا مطلب کیا تھا؛ اِس کا مطلب تھا ـــــــ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کو ختم کر کے اِسکی جگہ کتاب اللہ کی حکمرانی کا ثبت کرنا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے :ـــ

جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرلے تو اس کا لازمی نتیجہ مساوات، محکمیت اور آزادیؔ ہوگا۔ اسلام نہ کسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبینہ الوہیاتی اقتدار کو۔

(خطباتِ تشکیلِ جدید۔ انگریزی۔ صـ۱۴۷)

یہ تھی وہ قرآنی مملکت جسے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے انقلاب آفرین ہاتھوں نے قائم

کیا اور ساری دنیا میں اعلان کیا کہ آکر دیکھ لو کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست | عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہ نتیجہ تھا اس انسانیت ساز تغیر کا کہ

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست | نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۰)

قرآن نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس قوم (ہم مسلمانوں) نے کیا کیا؟ اسے بھی اقبالؒ کے الفاظ میں سن لیجئے:۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست | خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت | دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر!

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۷)

یعنی جس قوم نے دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ کیا تھا، اُس نے پھر نظامِ ملوکیت قائم کر لیا۔ بظاہر یہ ایک سیاسی انقلاب تھا، لیکن (اقبالؒ کہتا ہے کہ) یہ سیاسی انقلاب نہیں تھا۔ اس نے دین پر ملوکیت کا ٹھپہ لگا کر اسے مذہب میں تبدیل کر دیا، کیونکہ دین ملوکیت کو راس آ ہی نہیں سکتا۔ اور یہ تبدیلی مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے (بلکہ اس کے بل بوتے پر) رونما ہوئی۔

اُس دن سے لے کر آج تک ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، باہوں میں باہیں ڈال کر اُمت کو دین سے برگشتہ کئے چلی آ رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس (مروّجہ) اسلام کی جگہ قرآن کا الدین قائم کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ اس الدین (یعنی قرآنی نظامِ حکومت) کے قیام کا امکان ہندوستان میں تو ایک طرف، خود مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں، کیونکہ یہ مملکتیں بھی، ملوکیت[1] اور مذہبی پیشوائیت کا ملغوبہ تھیں۔ ہزار سال کی اس دُہری غلامی سے اُن کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست | ناز ہا اندر نیازش بود و نیست

نور در صوم و صلوٰتِ او نماند | جلوۂ در کائناتِ او نماند!

روح چوں رفت از صلوٰۃ از صیام | فرد ناہموار و ملت بے نظام

سینہ ہا از گرمئ قرآں تہی! | از چنیں مرداں چہ اُمید بہی

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو | ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

(جاوید نامہ صفحہ ۲۲۵)

لیکن اس کے باوجود وہ (اقبالؒ) اس سے مایوس نہیں ہوا —— جس کی نگاہیں قرآنی بصیرت سے مستنیر

---

[1] واضح رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت نہیں۔ اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظام ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو اور وہ کسی کے ہاتھوں متشکل ہو۔ اس وقت (مسلمانوں کی مملکتوں سمیت) ساری دنیا میں ملوکیت مسلط ہے۔

ہوں۔ وہ مایوس ہوا ہی نہیں کرتا۔ وہ نامساعد حالات کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لیتا ہے۔ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا کہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو، اور اس لوحِ سادہ پر قرآنی اسلام کا نقش ثبت کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مجوزہ مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ اس سے ہم انگریز یا ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے، نہ ہی انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس سے ہم پر معیشت کی راہیں کھل جائیں گی۔ یہ تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ

اس سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اسلام پر سے اس نقش کو مٹا سکیں جسے غربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔ (خطبہ الہ آباد)

یہ تھا ہمارے اس حسین و سادہ لیکن عظیم انقلاب آفریں سلوگن کا مقصود کہ

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی اس قرآنی نظام کا قیام جو:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں (ابلیس کی مجلس شوریٰ)

لیکن اقبالؒ کے اس خواب کی جو تعبیر ہم نے متشکل کی، اُسے:

کسی کلیسا میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی "ہری ہری"!

ہم نے اللہ کو تو (معاذ اللہ) ملک بدر کر دیا اور فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے آلہ تراش کر انہیں اپنا معبود بنا لیا۔ صدرِ اوّل میں تو پھر بھی قرآنی نظام قائم ہو جانے کے بعد، ہمارا تختہ اُلٹا تھا۔ یہاں ہمیں جھٹکوں بھی اس کا عکس تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کاہن و پاپا کی وہی قوتیں جنہیں شکستِ فاش ہوئی تھی، یورش کر کے یہاں آگئیں اور انہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا وہی مطلب یہاں عملاً ثبت کر دیا جسے وہ متحدہ ہندوستان میں اسلام کہہ کر پیش کرتی تھیں۔ اُن کا وہاں دعویٰ تھا کہ اُس اسلام کے لئے الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ان کے اس اسلام کو دیکھ کر جسے وہ پاکستان میں رائج کر رہے ہیں، ہماری نئی نسل نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اس اسلام کے لئے ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یوں ہم نے اپنی جیتی ہوئی بازی ہار دی ہے؛ اور قیامت بالائے قیامت، کہ ملک میں شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو اس شکست کے مضمرات کو دیکھ رہی ہو! ایسی حالت اُس وقت ہوتی ہے جب

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اور احساسِ زیاں کے جاتے رہنے سے اہلِ کارواں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ، رہزن کو یہ کہہ کر دعائیں دیتے ہیں کہ

نہ لُٹتے دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتے؟ (غالبؔ بہ ادنیٰ تصرف)

قوموں کی تباہی اس "بے خبر سونے" کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (نوشتہ ۱۹۸۱ء)

تبویب القرآن

پرویز صاحب کی وہ گراں قدر تالیف جسے بجا طور پر قرآنی انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں قریب اڑھائی ہزار موضوعات میں سے ہر موضوع کے متعلق قرآن مجید میں جہاں جہاں کچھ آیا ہے اس کے مرتب طور پر حوالے دیئے گئے ہیں۔ جن حضرات نے اس سے استفادہ کیا ہے ان کی رائے ہے کہ اس کے بعد قرآنی معلومات کے لئے کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔ ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن جلد ہی ختم ہو گئی اور فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ موجودہ گرانی کے زمانے میں اس قدر ضخیم کتاب کا جدید ایڈیشن شائع کرنا بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا، لیکن اس کے مطالبہ کی شدت کے پیش نظر ہمیں اس کا بیڑہ اٹھانا ہی پڑا۔

للہ الحمد کہ اس کی پہلی دو جلدیں چھپ گئی ہیں اور تیسری جلد زیر طبع ہے۔ امید ہے ایک ماہ کے اندر اندر اس کی طباعت مکمل ہو جائیگی۔ یہ اعلان ان حضرات کی اطلاع کے لئے (خصوصاً) شائع ہو رہا ہے جن کی فرمائشیں آ چکی ہیں یا جن کے مطالبات موصول ہو رہے ہیں۔ وہ تعمیل ارشاد کے لئے اگلے اعلان کا انتظار فرمائیں۔

باب المراسلات

جرائم کا انسداد

سوال:۔ آج کل پاکستان ہی میں نہیں، ساری دنیا میں جرائم جس کثرت سے عام ہو رہے ہیں اور جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں، تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی مل سکے زمانہ قدیم میں کسی خاص ملک یا خاص قوم میں جرائم نسبتاً زیادہ ہوتے تھے لیکن انہوں نے کبھی ایسی عالمگیر شکل اختیار نہیں کی تھی۔ پھر، وجہ حیرت جرائم کی اس قدر کثرت ہی نہیں، اس سے بھی زیادہ باعث تعجب یہ امر ہے کہ اقوام عالم کے دانشوروں مدبروں، سیاست دانوں، مصلحوں کی ہزار کوششوں کے باوجود ان جرائم کا سیلاب رکتا ہی نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ملائکہ نے انسان کی تخلیق پر جو بدگمانی ظاہر کی تھی کہ تو دنیا میں ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہے، جو مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (وہ دنیا میں خونریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گا) تو ان کے سامنے شاید ہمارا زمانہ ہی تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس عالمگیر وبا کا کوئی علاج بھی ہے؟

جواب:۔ جرائم کی کثرت اور ان کی برق رفتاری کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کونسا قلب حساس ہے جو ان سے وقفِ اضطراب، اور کون سا دیدۂ بینا ہے جو ان پر خونفشاں نہیں؟ باقی رہی یہ حیرت کہ ساری دنیا کے دانشوروں کی چیخ و پکار اور تگ و تاز کے باوجود، نہ صرف یہ کہ یہ سیلابِ بلا انگیز تھمتا نہیں، بلکہ آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصلحین اور معالجین، علتِ مرض کے بجائے، علاماتِ مرض کا علاج سوچتے ہیں۔ علتِ مرض کو علی حالہٖ رہنے دیتے، اور علاماتِ مرض کے علاج کی فکر کئے جاتے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ — چو در بندی ز روزن سر بر آرند — ایک علامت کا علاج کرو تو مرض دوسری جگہ سے اور شدت کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔ مقدم سوال علتِ مرض کی تشخیص کا ہے، یعنی اس سوال کا کہ انسان، جرائم کا مرتکب ہوتا کیوں ہے؟ اس کے لئے دیکھنا چاہئے کہ انسان (یا آدمی) ہے کیا؟

ارتقائی تحقیق بتاتی ہے کہ آدمی، حیوانات ہی کی آگے بڑھی ہوئی شکل ہے۔ یعنی

سلسلۂ ارتقاء میں حیوانات سے اگلی منزل کا نام آدمی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کے تقاضے وہی ہیں جو حیوانات کی طبعی زندگی کے تقاضے ہیں یعنی کھانا پینا، سانس لینا، اولاد پیدا کرنا اور مر جانا۔ ان تقاضوں کو جبلی تقاضے کہا جاتا ہے۔ یعنی تحفظِ خویش۔ تغلب خویش اور افزائشِ خویش۔ زندہ رہنا، خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت فراہم کرنا۔ اور اپنی نسل کو برقرار رکھنے کا تقاضا (اسے جنسی تقاضا کہا جاتا ہے)۔ یہ تقاضے حیوان اور انسان میں مشترک ہیں۔ زندگی (LIFE) کی ساری جدوجہد ان تقاضوں کی تسکین کے لئے ہے۔

جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے، ان تقاضوں کی تسکین کے لئے فطرت نے ان پر کنٹرول عائد کر رکھا ہے۔ شیر بے پناہ قوتوں کا مالک ہوتا ہے لیکن جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر وہ کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ شیر کو تو ہم نے دیکھا نہیں۔ ایک بیل کے سامنے چارے کا ڈھیر رکھا ہو۔ جب اس کا پیٹ بھر جائیگا تو وہ اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جائے گا۔ اسے اس کی فکر نہیں ستائے گی کہ باقی چارہ کون لے جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، شیر بھوکا مر جائے گا لیکن چارے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ بیل کتنا ہی بھوکا ہو، گوشت کے پاس تک نہیں جائے گا۔ جنسی جذبہ تمام جذبات سے شدید ہوتا ہے۔ لیکن اس پر بھی فطرت کے کنٹرول کا یہ عالم ہے کہ ایک بیل (سانڈ) گایوں کے گلہ میں سال بھر پھرتا رہے گا لیکن کسی گائے کی طرف "بگڑ بد" سے دیکھے گا بھی نہیں۔ اس کے بعد جونہی فطرت کا اشارہ ہوگا، وہ جنسی اختلاط کر لیگا، اور اس کے بعد پھر حسبِ سابق چلتا پھرتا رہے گا۔

فطرت کے اس کنٹرول کا نتیجہ یہ ہے کہ حیوانات میں جرائم نہیں ہوتے وہ اپنی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کے برعکس "حضرت انسان" کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے جبلی تقاضے تو وہی ہوتے ہیں جو حیوانات کے ہیں۔ لیکن ان پر فطرت کی طرف سے کنٹرول نہیں عائد کیا گیا۔ اسے ان پر خود کنٹرول عائد کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ ان پر کنٹرول عائد کر لے گا تو جرائم کا ارتکاب نہیں ہوگا۔ اگر انہیں بے مہابا چھوڑ دیگا تو جرائم عام ہوں گے۔ اتنا ہی نہیں کہ جرائم عام ہوں گے بلکہ ان جرائم کی نوعیت اور شدت بھی بے پناہ ہوگی۔ شیر ایک وقت میں ایک آدھ ہرن کو چیر پھاڑ سکتا ہے اور اس کے غلبہ و تسلط کا احاطہ پانچ دس میلوں تک محدود ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس شیر (یعنی خون خوار حیوان) کی جست کی وسعت چاند تک ہو، اور وہ ایٹم بم بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور اس کے جذباتی تقاضوں پر کسی قسم کا کنٹرول نہ ہو، تو اس کی ہلاکت آفرینیوں اور فساد انگیزیوں کا عالم کیا ہوگا؟ یہی عالمگیر جرائم بعض افراد میں بھی اور

اقوام میں بھی۔

سو، سارا سوال یہ ہے کہ انسان پر کنٹرول کس طرح عائد کیا جائے؟

ہمارے زمانے میں زندگی کا سیکولر تصور عام ہو گیا ہے۔ سیکولر تصور کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی (حیوانات کی طرح) محض طبیعی زندگی ہے۔ اب غور کیجئے کہ انسان کو قرار دیا جائے ایک حیوان۔ اس حیوان کی قوتیں ہوں حدود فراموش، اور (فطرت کی طرف سے) اس پر کنٹرول عائد نہ ہو، تو اس کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ کسی شیر کو چڑیا گھر کا پنجرہ توڑ کر شہر میں آنے دیجئے، بات سمجھ میں آ جائے گی۔

جرائم کی روک تھام کی تدابیر سوچنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کا تصور تو بدستور سیکولر رکھتے ہیں اور اس پر خارج سے پابندیاں عائد کرنے کی تدابیر سوچتے ہیں۔ یہ پابندیاں کس قسم کی ہوتی ہیں؟ وہ قوانین بناتے ہیں، پھر ان قوانین کو نافذ کرنے کے لئے (یعنی مجرموں کو ان کا پابند کرنے کے لئے) انتظامیہ۔ پولیس۔ جیل خانے وغیرہ "قائم کرتے ہیں۔ دو لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ درحقیقت دو قوتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اگر مجرم کی قوت، انسدادی قوت سے کم ہوتی ہے تو وہ سر دست مغلوب ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ ہوتی ہے تو انسدادی قوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ ان قوتوں میں، مادی قوت کے علاوہ، ذہنوں کی قوت بھی کارفرما ہوتی ہے۔ قانون شکنی، مادی قوت سے زیادہ، ذہنی قوت کی رُو سے ہوتی ہے۔

بالفاظِ دیگر، انسدادِ جرائم یا اصلاحِ معاشرہ کی تدابیر کرنے والے، انسان پر خارج سے پابندیاں عائد کرنے کی تجاویز اور انتظامات سوچتے ہیں۔ اور یہ طریقِ عمل، اس مقصد کے حصول کے لئے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انسانوں کی وضع اور عائد کردہ ہر تدبیر اور تحدید کا توڑ دوسرا انسان سوچ سکتا ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ قانون شکنوں کا ذہن، قانون سازوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تیز ہوتا ہے۔ مؤثر اور کامیاب علاج وہ ہو گا جس میں انسان اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کرے۔ یہ پابندیاں انسان اسی صورت میں عائد کر سکتا ہے کہ اس کا تصورِ زندگی بدل جائے۔ یعنی وہ یہ نہ سمجھے کہ انسان کی زندگی حیوان ہی کی طرح طبیعی (سیکولر) زندگی ہے۔ اسے یقین ہو کہ انسانی زندگی، حیوانی زندگی سے بلند و برتر ہے اور اس زندگی کا سنوارنا مقصدِ حیات ہے۔ انسان کی طبیعی زندگی کا قیام طبیعی اسباب کے ذریعے ہوتا ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کا مدار اخلاق اقدارِ خداوندی (VALUES) پر ہوتا ہے۔ ہر چند اس کی طبیعی زندگی کا قیام اور استحکام بھی ضروری ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کی قدر و قیمت اس کی طبیعی زندگی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے

جب کبھی اس کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی زندگی کے تقاضے (اخلاقی اقدار) میں (TIE) پڑ جائے تو انسانی زندگی کے تقاضے کو ترجیح دینی چاہیئے۔

انسان کی انسانی زندگی کی ماہیت اور اخلاقی اقدار کی کنہ و حقیقت ایسے مسائل ہیں جن کی تفصیل کی اس جگہ گنجائش نہیں۔ ہم انہیں گذشتہ چالیس سال سے اپنے لٹریچر میں پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مقام پر ہم اس نکتہ کو مختصر اور عام فہم انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ وہ تو پاگل ہے۔ اسے اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہیں یعنی ہوشمند وہ ہے جسے اپنے نفع و نقصان کا خیال ہو جو ان میں امتیاز نہ کرے اسے پاگل کہا جاتا ہے۔ ہوشمند انسان جس بات کو اپنے لئے نقصان رساں سمجھتا ہے وہ اس سے اجتناب کرتا ہے۔ اسے اس سے روکنے کے لئے خارجی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سنکھیا کھانے سے اس لئے پرہیز نہیں کرتا کہ اسے کوئی سپاہی دیکھ لے گا، نہ ہی وہ آگ میں اس لئے ہاتھ نہیں ڈالتا کہ اسے کسی مجسٹریٹ نے ایسا حکم دیا ہے۔ یہ اس کے اندر کے تقاضے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے اوپر آپ پابندی عائد کرتا ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے اس کا یقین ہو کہ یہ پابندی اس کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے اس کا یقین ہو کہ اس کے لئے وہی بات منفعت بخش ہے جو اس کی انسانی زندگی کے لئے موجب تقویت ہے۔

لیکن سیکولر نظریہ حیات کی رُو سے "انسانی زندگی" کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی منفعت یا مضرت کے متعلق سوچنے کا سوال ہی زیر غور نہیں آ سکتا۔ اس میں نفع نقصان کا مقابلہ یا موازنہ طبیعی معیار کی رو ہی سے ہوگا۔ جو کچھ طبیعی زندگی کے لئے نفع بخش ہو اس کا ہر طریق سے حاصل کر لینا کامیابی۔ آپ شاید یہ کہہ دیں کہ مذہبی ممالک میں تو زندگی کا نظریہ سیکولر نہیں۔ اس لئے وہاں بھی جرائم کی وہی کثرت ہے۔

یہ ہماری غلط فہمی ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ مذہبی ممالک میں نظریہ حیات سیکولر نہیں۔ وہاں بھی نظریہ حیات سیکولر ہی ہے۔ آپ خود پاکستان کی مثال لے لیجئے۔ یہاں "اسلامیانے" کی ابتدا "حدود" (یعنی سزاؤں سے متعلق قوانین) سے ہوئی۔ یعنی سمجھا یہ گیا کہ جرائم کا انسداد خارج سے عائد کردہ پابندیوں کی رُو سے ہو سکتا ہے۔ سابقہ قوانین میں سزائیں نرم تھیں۔ اب انہیں زیادہ سخت کر دیا گیا۔ اکتنازِ دولت سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا علاج یہ سوچا گیا کہ بینکوں میں جمع شدہ روپے سے اڑھائی فیصد "زکوٰۃ" کاٹ لی جائے۔ اس سے یقیناً دولت پاک ہو جائیگی۔ یعنی وہی خارج سے عائد کردہ پابندی سے اصلاح کا سیکولر طریق! شور مچایا جا رہا ہے کہ معاشرہ میں فحاشی عام ہو رہی ہے۔ بے حیائی وبائی امراض کی طرح پھیل رہی ہے۔ اس کا علاج

یہ بتایا جا رہا ہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند کر دو۔ یعنی وہی خارج سے عائد کردہ سیکولر پابندی۔ کسی کا دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ قرآن کریم نے اس کا علاج کیا بتایا تھا!

قرآن کریم میں جملہ انبیاء کرامؑ کے ان انقلابات کا ذکر آیا ہے جو انہوں نے اپنی اپنی قوم کے اجتماعی نظام میں برپا کئے۔ لیکن ان میں ایک نبی کی انفرادی زندگی کا تذکرہ کیا ہے، اور وہ ہیں حضرت یوسف (علیہ السلام)۔ ان کی حیاتِ طیبہ کی کون سی خصوصیت ہے جسے قرآن نے اپنے اوراق میں ابدی طور پر محفوظ کر لیا ہے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ عورتیں بے پردہ باہر پھرتی ہیں اس لئے مردوں کا ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ انہیں گھروں کے اندر بند کر دو۔ وہاں یہ کیفیت ہے کہ دولت و حشمت، اقتدار و اختیار کی مالکہ، صاحبِ حسن و جمال عورت، گھر کے اندر ہے۔ وہاں نوجوان (حضرت) یوسفؑ کے سوا کوئی نہیں۔ وہ انہیں ترغیب ہی نہیں دلاتی، مجبور کرتی ہے۔ لیکن وہ دامن چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس معاشرہ کی لہرہ وشوں اور سحر آفرینوں کا ایک ہجوم انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے وہ انہیں دھمکی بھی دیتی ہیں کہ اگر ہماری بات نہ مانی تو جیل خانے بھجوا دیئے جاؤ گے وہ ان ہر دو ممکنات میں موازنہ کرتے ہیں، اور انتہائی جرأت و بیباکی سے کہتے ہیں کہ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ (۱۲/۳۳) "جس بات کی طرف یہ مجھے دعوت دیتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے"۔ اس "اَحَبُّ" نے اصلاح و انسدادِ جرائم کا سارا فلسفہ واضح کر دیا۔ یعنی میں اس دعوت کے مقابلہ میں قید کی زندگی اپنے لئے زیادہ منفعت بخش سمجھتا ہوں۔ یہ ہے معاشرہ سے فحاشی ختم کرنے کا طریق نہ کہ عورتوں کو گھروں میں بند کر دینے کی تجاویز!

ساحرینِ دربارِ فرعون نے جب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش کردہ صداقت کو پہچان کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تو استبداد و جبروت کے مجسمہ فرعون نے گرج کر کہا کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اس مسلک کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب دیکھو کہ میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تمہیں صلیب پر لٹکا دوں گا۔ انہوں نے ہر دو ممکنات کا موازنہ کیا اور دل کے پورے اطمینان کے ساتھ کہا کہ ہم نے تمہاری بات سن لی ہے۔ اس پر غور بھی کر لیا ہے۔ لیکن ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وَاللّٰہُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (۲۰/۷۳) تمہاری فرمان پذیری کے مقابلہ میں اطاعتِ خداوندی ہزار درجہ بہتر اور پائندہ ہے۔ جماعتِ مومنین سے (بوساطت نبی اکرمؐ) کہا گیا کہ تمہارے مخالفین نے باطل طریق سے جو کچھ جمع کر رکھا ہے اس سے تم مسحور نہ ہو جانا۔ یاد رکھو: رِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (۲۰/۱۳۱) تو آئینِ خداوندی کے مطابق حاصل کردہ رزقِ حلال اس سے کہیں زیادہ بہتر اور پائندہ تر ہے۔ وہی سیکولر نظریۂ حیات، اور قرآنی نظریۂ حیات میں تقابل!

مستقل اقدار کی رُو سے حاصل شدہ منفعت کس قدر گراں بہا ہوتی ہے، اس کی آج کل کوئی عملی مثال پیش کرنا قدرے مشکل ہے۔ لیکن اب سے کچھ عرصہ پہلے ہمارے ہاں، معاشرہ میں عزت کو سب سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں کا مشہور محاورہ تھا۔ مال ہے صدقۂ جان۔ جان صدقۂ آبرو۔ مال اور جان میں تقابل تو سیکولر نظریہ میں بھی ممکن تھا۔ لیکن جان (بلکہ جان اور مال دونوں) کے مقابلہ میں عزت، آبرو کی قیمت زیادہ تصور کی جاتی تھی۔ جرائم کی روک تھام کے لئے یہی قدر کافی مؤثر ذریعہ ہوتی تھی۔ مجرم اپنے آپ کو معاشرہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ اسلئے وہ ارتکاب جرم سے پہلے دس بار سوچتا تھا اور معاشرہ میں بدنامی کا احساس اسے اس سے باز رکھنے میں بڑا مؤید ثابت ہوتا تھا۔ تقسیم ملک سے پہلے کا ایک واقعہ ہمیں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ غالباً ہوشیارپور یا جالندھر کے اضلاع کے ایک گاؤں کے قتل کے مقدمہ میں اثباتِ جرم کا دارومدار، قاتل کے دادا کی شہادت پر تھا جسے گاؤں میں بڑی عزت حاصل تھی۔ تمام رشتہ داروں نے اس پر زور دیا کہ وہ جھوٹی گواہی دے آئے۔ اس سے اس کے جوان پوتے کی جان بچ جائیگی۔ وہ یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ اس طرح وہ گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس کے تفہیم انکار کے باوجود، انہوں نے اسے گواہی دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ گواہی دے کر کمرہ عدالت سے باہر آیا تو کسی طرف نکل گیا۔ اور اس کے بعد ساری عمر گاؤں نہیں آیا۔ یہ تھا عزت کا احساس جو انسان کو جرم کے لئے ایک مؤثر ذریعہ بنتا تھا۔

لیکن اس زمانے میں عزت کا معیار، پاکیزہ زندگی تھی۔ اس لئے جس بات سے، اس پر ذرا سا بھی حرف آتا ہو، وہ اس سے مجتنب رہتے تھے۔ اور تمام لوگ ان کی عزت کرتے تھے لیکن اب عزت کا معیار ہی بدل گیا ہے۔ اب پاکیزہ زندگی اور حسنِ کردار کو کوئی پوچھتا نہیں اب عزت کا معیار دولت یا اقتدار رہ گیا ہے۔ جس نے (جائز یا ناجائز طریق سے) چار پیسے اکٹھے کر لئے معاشرہ میں صاحبِ عزت بن گیا۔ جسے کچھ اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا (خواہ کسی طریق سے ہو) وہ معزز سمجھا جانے لگا خواہ اس کی زندگی کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ سب سیکولر نظریۂ حیات کا نتیجہ ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ اس نظریہ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ جو دوڑ (RACE) میں آگے بڑھ گیا، جس نے تیرنے میں سبقت حاصل کر لی، جس نے سب سے اونچی چھلانگ لگا دی، جس نے زیادہ وزن اٹھا لیا، جس نے زیر دست مکے مار دیئے، ان کے جلوس نکلنے اور زندہ باد کے نعرے لگنے لگتے ہیں، بلا لحاظ اس امر کے کہ ان کا ذاتی کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان ورزشوں میں حصہ نہیں لینا چاہیئے یا سبقت حاصل نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ عزت کے معیار کے لئے ذاتی کیریکٹر کو مقدم قرار دینا چاہیئے۔

باقی اقدار کو چھوڑ دیجئے۔ اگر ابتداء اس سے کر لی جائے کہ معاشرہ میں عزت اس کی ہو، جس کی زندگی پاکیزہ ہو۔ جو نیک کردار ہو، بلا لحاظ اس کے کہ اس کی دنیاوی پوزیشن کیسی ہے۔ اور کسی ایسے صاحبِ حیثیت و اختیار کی عزت نہ ہو جس کے اخلاق پاکیزہ نہ ہوں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے جرائم کا کس حد تک انسداد ہو جاتا ہے۔ وہ اس احساس سے کہ میں معاشرہ میں بدنام ہو جاؤں گا اپنے آپ پر خود پابندیاں عائد کر لے گا۔ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ تم میں سے سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ ہے جس کا کردار سب سے زیادہ پاکیزہ ہے تو اس نے اس سے جرائم کے ارتکاب کے دروازے کے آگے بھی روک کھڑی کر دی تھی۔

یہ سیکولر نظریہ سے قرآنی نظریہ زندگی (یعنی حیوانی نظریہ سے انسانی نظریہ) کی طرف آنے کا قدمِ اوّل ہوگا۔ لیکن نظریہ زندگی کی یہ تبدیلی قانون کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ یہ قلب و نگاہ کی تبدیلی سے ہو گی جسے ایمان کہتے ہیں۔ اور قلب و نگاہ کی تبدیلی کا ذریعہ تعلیم و تربیت ہے۔ نبی اکرمؐ نے (ارشادِ خداوندی کے مطابق) "تعلیم کتاب و حکمت" کے ذریعے یہ تبدیلی پیدا کی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ معاشرہ سے جرائم ناپید ہو گئے تھے۔ لیکن اس کیساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کی طبعی ضروریات کی فراہمی کا اطمینان بخش انتظام مملکت کے ذمے ہو۔ اسلامی مملکت کے قیام کے لئے یہ پروگرام ہوگا۔

۲۔ انتخابات

سوال:۔ آج کل انتخابات کے سوال نے خاصی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ ایک اسلامی حکومت میں انتخابات کی صورت کیا ہوگی۔ کیا اس میں کچھ لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے سے (DEBAR) بھی کیا جا سکے گا؟

جواب:۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ محترم مستفسر نے خود ہی "اسلامی حکومت" کی تخصیص کر دی ورنہ ہمارے ساتھ ہو یہ رہا ہے کہ ہم جب کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، اسلامی مملکت میں یوں ہوگا تو اسے موجودہ مسلمانوں کی مملکتوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (جو اسلامی نہیں بلکہ سیکولر ہیں) اور جب وہ ان میں فٹ نہیں بیٹھتا تو اعتراض کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم متعدد بار بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت وہ ہوتی ہے:۔

(۱) جس کا تمام کاروبار کتاب اللہ کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔

(۲) جس کے احکام و قوانین کا تمام مسلم آبادی پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق ہوتی ہے، نہ ہی مذہبی فرقوں کا وجود۔ اس میں

تمام امت احکام خداوندی کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔ اس میں کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہوتا۔

۳۔ اس کی عمرانی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہوتا ہے اور نہ ہی کسی انسان کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، اس میں نہ بھوک ہوتی ہے نہ خوف۔ اب آیئے استفسار زیرِ نظر کی طرف۔ قرآن کریم میں بعض احکام (ان کی جزئیات سمیت) متعین طور پر دیئے گئے ہیں۔ انہیں بلا تغیر و تبدل نافذ کرنا ہوگا۔ ان کے نفاذ کے طریق البتہ اسلامی حکومت خود وضع کریگی۔

قرآن کریم میں بعض احکام اصول کے طور پر دیئے گئے ہیں۔ ان کی جزئیات اسلامی حکومت خود مرتب کریگی۔ قرآنی احکام و اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن جو کچھ اسلامی حکومت وضع کریگی وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق قابلِ تغیر و تبدل ہوگا۔

اسلامی حکومت کے تمام معاملات امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ یہ مشاورت کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوگی۔

اس مشاورت کے لئے قرآن مجید نے کوئی مشینری متعین نہیں کی۔ اسلامی حکومت اپنے حالات کے مطابق یہ مشینری خود وضع کریگی۔ آج کل اس کا ممکن العمل طریق انتخابات سمجھے جاتے ہیں۔ اس باب میں قرآن کریم کا اصولی حکم یہ ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) اس میں اَمْرُهُمْ میں بھی ضمیر جمع کی ہے اور بَيْنَهُمْ میں بھی جمع کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کی رُو سے ملکت ساری امت کی ہوتی ہے، کسی فرد یا افراد کے خاص گروہ کی نہیں۔ اور مشاورت میں بھی تمام امت شریک ہوگی۔ کوئی خاص طبقہ نہیں۔ قرآن کریم نے عام معاہدات کے لئے بالغ ہونے اور فاتر العقل نہ ہونے کی جو شرائط عائد کی ہیں، ہمارے خیال میں یہی بنیادی شرائط انتخابات کے سلسلہ میں بھی عائد کی جاسکیں گی۔ باقی رہا کسی کو اس حق سے محروم (DEBAR) کرنا تو قرآن کی رُو سے مشاورت کے اس بنیادی حق سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکے گا۔

ہمارے نزدیک، رائے دہندگی دراصل اس امر کی شہادت ہے کہ امیدوار اس ذمہ داری کا اہل ہے۔ قرآن کریم نے شہادت کو تمام مومنین پر فرض قرار دیا ہے (۴/۱۳۵)۔ اور کتمانِ شہادت (شہادت چھپانے) کو سنگین ترین جرم (۲/۲۸۳، ۵/۱۰۶)۔ جب کتمانِ شہادت جرم ہے تو ایسے حالات پیدا کر دینا جن میں کوئی شخص شہادت دے ہی نہ سکے، اس سے بھی زیادہ سنگین جرم ہوگا۔ اس

ہیں البتہ ایک استثناء ہے۔ قرآن کریم نے عفت مآب خواتین کے خلاف تہمت تراشی (قذف) کی سزا کے طور پر کہا ہے۔ کہ ایسے شخص کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک شکل ہے جس میں کسی کو حق شہادت (رائے دہندگی) سے محروم کیا جا سکتا ہے۔

کسی کو حق رائے دہندگی (شہادت) سے محروم قرار دینا بالفاظ دیگر اسے ناقابل اعتبار قرار دینا ہے اور یہ انسان کی تذلیل ہے۔ تذلیلِ انسانیت کسقدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خلافت حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک گورنر نے کسی غیر مسلم (ذمی) کو غصہ میں کہہ دیا: اخزك الله۔ خدا تجھے ذلیل کرے۔ بعد میں انہیں اس پر اس قدر ندامت ہوئی کہ خود استعفیٰ لکھا اور باب خلافت میں جا کر پیش کر دیا۔ انہیں بہتیرا سمجھایا گیا اس کا کفارہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اس پر مصر رہے کہ (ان کے نزدیک) جو شخص کسی انسان کو ذلیل کرتا ہے وہ کسی منصب پر فائز رہنے کا مستحق نہیں۔

انہی کی خلافت کے زمانے میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ کسی کو منافق کہہ دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ اس کی ذلت کیا ہو سکتی ہے؟ حضرت عمرو بن عاصؓ سے کہا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو، ورنہ تمہیں سزا ملے گی۔ (شاہکار رسالت ص۳۲۴)

لیکن اسے پھر نوٹ کر لیجئے کہ یہ اسلامی مملکت کی باتیں ہیں سیکولر حکومتوں کی نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی بھی کیوں نہ ہوں!

ایک بات سیکولر حکومتوں کی بھی غور طلب ہے۔ ان میں بھی کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں دھاندلی نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ دھاندلی سے مطلب کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ انتخابات کرانے والے ایسے حربے اختیار کرتے ہیں، جن سے ان کی مرضی کے امیدوار منتخب ہو کر آئیں۔ اس الزام سے بچنے کے لئے چالاک انتخاب کرانے والے کرتے یہ ہیں کہ حلقہ ہائے انتخاب کے تعین، امیدواروں کی خصوصیات اور رائے دہندگان کی شرائط ایسی وضع کرتے ہیں جن کی رُو سے ان کی مرضی کے امیدوار منتخب ہو کر آئیں۔ اس سے سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی

اسلامی مملکت میں ایسا نہیں ہوتا۔ دھاندلی سے مطلوب حصولِ اقتدار ہوتا ہے اور اسلامی معاشرہ میں منتخب نمائندگان کو کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر آ پڑتا ہے۔ اس بوجھ کا احساس کسقدر لرزہ انگیز ہوتا ہے اس کا

اندازہ اس سے لگائیے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت جب کسی نے تجویز کیا کہ ان کے بعد، ان کے بیٹے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے تو انہوں نے (یوں کہئے گویا ہاتھ جوڑ کر) کہا کہ نہ بابا! معاف کرو۔ اگر یہ اچھی بات ہے تو خاندانِ خطاب اس سے بہرہ یاب ہو چکا ہے۔ اب یہ سعادت دوسروں کے حصے میں آنی چاہیئے۔ اور اگر اس میں کوئی مضرت کی بات ہے تو خاندانِ خطاب میں سے ایک اس سے بھگت چکا ہے، باقیوں کو محفوظ رہنے دیجئے (شاہکار رسالت ص۴۲۱)

یہ کیفیت ہوتی ہے اسلامی مملکت میں امورِ حکومت سرانجام دینے کی۔ وہاں قانون سازی ہی پر نہیں، انسانیت سازی پر بھی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اور انسانیت کے پرکھنے کا معیار کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی حضرت عمرؓ ہی کے ایک ارشاد سے لگ سکتا ہے۔ کسی متنازعہ معاملہ میں آپ نے متعلقہ شخص سے کہا کہ اپنے دعویٰ کی تائید میں کسی قابلِ اعتماد شخص کو لاؤ۔ اس نے ایک شخص کا نام لیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کی ہمسائیگی میں رہے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، تو آپ نے پوچھا کہ کیا اس کے ساتھ تم نے کبھی سفر کیا ہے۔ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی کوئی معاملہ کیا ہے۔ اس پر بھی اس نے نہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے اسے مسجد میں سر اٹھاتے سر جھکاتے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے! جاؤ اور کسی ایسے شخص کو لاؤ جس کے قابلِ اعتماد ہونے کا تمہارے پاس کوئی واقعی ثبوت ہو۔

قابلِ اعتماد ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ شخص دوسروں کے ساتھ معاملات میں کیسا ہے؟ خود قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ "اصل نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ اصل نیکی یہ ہے کہ تم بشرطِ ایمان، فلاح و بہبودِ انسانیت کے لئے کیا کرتے ہو؟" (۲/۱۷۷)۔ (پوری آیت قرآن کریم میں دیکھئے)

۳۔ (مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

ایک نوجوان طالب علم کی طرف سے سوال:۔

آج کل شہر میں (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ ۲۷ مارچ کے اخبار جنگ میں ایک اعلان شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام، جناح ہال میں ایک جلسہ ہوگا جس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کریں گے۔ خطبہ صدارت کا موضوع ہوگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اور حضرت شیخ الہندؒ کا ان سے خصوصی تعلق۔

ہم نے سن رکھا ہے کہ (مولانا) آزاد، مطالبۂ پاکستان کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے، پھر ایسے شخص کا پاکستان میں چرچا کیسے؟

طلوعِ اسلام

ہمارا المیہ یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی جس سے ہماری نئی نسل کو بوثوق معلوم ہو سکے کہ کون مطالبہ پاکستان کا مخالف تھا اور کون موافق۔ یوں تو نیشنلسٹ علماء (باستثناء چند) تمام کے تمام اس کے مخالف تھے لیکن ان میں، (مولانا) ابوالکلام آزاد، (مولانا) حسین احمد مدنی اور (مولانا) ابوالاعلیٰ مودودی (مرحومین) کے نام سرفہرست تھے۔ مولانا مودودی کا تو وہاں کچھ خاص اثر نہیں تھا، لیکن باقی دونوں کا مسلمانوں کے حلقوں میں بڑا اثر تھا اور (مولانا) آزاد کی بیرونِ ہند بھی شہرت تھی۔ مذہبی حلقوں میں ان کا یہی مقام تھا جس کی وجہ سے ہندوؤں نے انہیں اپنے ساتھ ملایا اور ان کا اس قدر چرچا کیا تھا۔ (مولانا) آزاد کو تو انہوں نے کانگریس کا صدر بھی بنا دیا تھا۔

پاکستان میں یہ سازش کہ ان حضرات کو ملّت کا محسن اور اسلام کا بہت بڑا علمبردار بنا کر پیش کیا جائے، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں (لاہور) سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا (MAKERS OF PAKISTAN)۔ لکھنے والے تھے۔ اے۔ ایچ۔ البیرونی۔ اس کتاب میں کہا گیا تھا۔

> وہ قوتیں جو سنہ ۱۹۱۳ء میں ابوالکلام آزاد کی وساطت سے پیدا ہوئی تھیں انہیں اب اسلامی جماعت کے امیر مولانا مودودی پھر ایک نقطہ پہ مرتکز کر رہے ہیں۔ جو لوگ پاکستان میں تھیا کریسی کی حکومت کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ اسے محسوس کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ اسی راستے کو اختیار کر رہے ہیں جس کا سراغ مدیر الہلال (مولانا آزاد) نے دیا تھا۔ تحریک اسلامی جماعت کے قائدین اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر رہے تھی کہ ان میں سے بعض نے سنہ ۱۹۴۶ء میں اس امید کو ظاہر کیا تھا کہ مولانا آزاد جنہوں نے سنہ ۱۹۱۳ء میں مسلمانانِ ہند کے سامنے حکومتِ الٰہیہ کو بطور منزل پیش کیا تھا اب پھر ان کی قیادت سنبھالیں گے۔

اس کے بعد مصنف کتاب نے لکھا تھا۔

> جو لوگ تھیا کریسی کا قیام چاہتے ہیں کیا ان میں سے کوئی بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس ہستی کو محبت کی نگاہوں سے نہ دیکھے جس نے پہلے پہل اس منزل کا سراغ دیا تھا اور یہ نہ چاہے کہ اس تحریک کی باگ پھر انہی کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے؟ انشاء اللہ وہ دن آئے گا اور بہت جلد آئے گا جب

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ سب ایک ہی صف میں دکھائی دیں گے..... اگر مولانا مودودی (مرحوم) اور ان کے شریکِ کار کامیاب ہو گئے تو پاکستان میں سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ کے تصورات کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ ان تصورات کی حکومت ہوگی جنہیں ابوالکلام آزاد نے عام کیا تھا۔ (طلوعِ اسلام ستمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۵)

مولانا آزاد اور (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحومین) وفات پا گئے تو (مولانا) مودودی (مرحوم) ان کے اس مقصد کی تکمیل میں کوشاں رہے کہ پاکستان میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام پنپنے نہ پائے۔ مودودی صاحب کی وفات کے بعد یہی فریضہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا سید احمد اکبر آبادی، ایول سمجھئے گویا، مولانا مدنی (مرحوم) کے جانشینوں میں سے ہیں۔ پاکستان میں ان کے زیرِ صدارت اجلاس میں مولانا آزاد (مرحوم) کے نام کو زندہ کرنے کی سعادت حاصل کرنا انہی کی انجمن کا کام ہو سکتا تھا! یہ ابھی ابتدا ہے — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف ادوار اور مطالبہ پاکستان کی ان کی مخالفت کی تفاصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ ہم ان کے متعلق تقسیم ہند سے بہت پہلے سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت ہم صرف اتنا بیان کرنے پر اکتفا کریں گے کہ قائدِ اعظمؒ انہیں (مولانا آزاد) کو کیا سمجھتے تھے۔

۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ مسٹر گاندھی، مصالحت کی گفت و شنید کے لئے، قائدِ اعظمؒ کے ہاں آ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے ساتھ مولانا آزادؒ کو بھی لانا چاہتے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے انہیں ایسا کرنے سے فوراً منع کر دیا اور بذریعہ تار کہا کہ آپ اور جسے بھی چاہے ساتھ لے آئیے لیکن آزاد صاحب کو ہرگز ساتھ نہ لائیے میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد نے، بہ حیثیت صدر، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، قائدِ اعظمؒ سے ایک نکتہ کی وضاحت بذریعہ تار چاہی۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے وہ تار بھیجا جس نے ہندوستان ہی میں نہیں، بین الاقوامی ایوانِ سیاست میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ انہوں نے مولانا آزاد کو (YOUR SHOW — BOY OF CONGRESS) کہہ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا:

چونکہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد کلیتہً کھو چکے ہیں اس لئے میں بذریعہ خط و کتابت یا کسی اور نہج سے آپ سے ان معاملات پر بات

نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ آپ کو ایک نانشی صدر بنانے سے ہندوؤں کا اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ کانگریس یقیناً ایک قومی جماعت ہے اور اس طرح باہر کی دنیا کو دھوکا دیا جائے۔ آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں کے۔ کانگریس ہندو جماعت ہے اس لئے اگر آپ کو عزتِ نفس کا کچھ بھی پاس ہے تو اس جماعت سے فوراً مستعفی ہو جائیے۔ آپ نے اس وقت تک لیگ کی تخریب کیلئے انتہائی کوشش کر دیکھی اور آپ کو علم ہے کہ آپ کس طرح اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہیں۔ اب ان حرکات کو چھوڑ دیجئے۔"

جو لوگ قائدِ اعظمؒ کی زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ کس قدر شائستگی اور تہذیب کے پیکر تھے۔ انہوں نے مولانا آزاد کو جو اس قدر درشت پیرایہ میں جواب دیا تھا تو اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ مولانا آزاد کی پاکستان دشمنی ان کے لئے کسقدر شدید صدمہ کا باعث تھی۔ اور بات تھی بھی اس قدر شدید صدمہ کی۔ اگر یہ حضرات ہندو کے ہمنوا نہ ہوتے تو پاکستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اب انہی مولانا آزاد کی شان میں اسی پاکستان میں، قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔

۴۔ قتلِ عمد میں دیت

سوال:۔ آج کل قصاص اور دیت (جرمِ قتل کی سزا) سے متعلق قوانین کا مسودہ زیرِ غور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں قتلِ عمد کے لئے بھی دیت (خون بہا) کی گنجائش رکھی گئی ہے حالانکہ قرآن مجید کی رُو سے دیت صرف قتلِ خطا میں جائز ہے۔ اس کی (یعنی قتلِ عمد کی سزا کے طور پر دیت کی) تائید میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ آیۂ قصاص (سورۂ بقرہ آیت ۱۷۸) کے دوسرے حصے میں فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ آیا ہے جس سے واضح ہے کہ مقتول کے وارثوں کو دیت کا حق حاصل ہے۔ کیا آپ قرآن کریم کی رُو سے اس پر روشنی ڈالیں گے؟

جواب:۔ قرآن کریم نے اپنے مطالب اور مقاصد کے سمجھانے کا ایک طریق خود ہی بھی متعین کر دیا ہے جسے وہ "تصریفِ آیات" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کسی ایک جگہ کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی تشریح دوسرے مقام پر کرتا ہے۔ اس میں استثناء کسی اور جگہ۔ اضافہ کسی اور مقام پر۔ قرآن کے حکم کو صحیح طور پر

سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کسی ایک آیت تک ہی محدود نہ رہا جائے بلکہ اس نے جہاں جہاں اس حکم کے متعلق کچھ کہا ہو، ان تمام آیات کو سامنے رکھ کر نتیجہ پر پہنچا جائے۔ اس سے وہ حکم واضح اور مکمل طور پر سامنے آجائے گا۔ اس کی بکثرت مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔۔۔۔ سورۃ النساء آیت ۳ میں کہا گیا ہے۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ ظاہر ہے کہ اس میں حرام اور حلال کی کوئی تخصیص یا تفریق نہیں۔ اگر کوئی شخص صرف اسی ایک آیت سے قانون وضع کرنا چاہے تو ظاہر ہے کہ وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔ صحیح طریق یہ ہوگا کہ اس آیت کو، آیت ۲۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جس میں ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ اس طرح قرآن کا قانون ہمارے سامنے آسکے گا۔ یعنی جن عورتوں کو حلال قرار دیا گیا ہے ان میں سے جو تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔

اس قاعدے کے مطابق، قتل سے متعلق قرآنی آیات کو دیکھئے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۸ کے پہلے حصہ میں جرم قتل کی سزا موت بتائی گئی ہے۔ اس میں قتل عمد اور قتل خطا میں تفریق نہیں کی گئی۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اسی آیت تک محدود رکھے گا تو وہ کہے گا کہ قرآن کی رو سے ہر قسم کے قتل کی سزا موت ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے، اس آیت کو جب سورۃ النساء کی آیات ۹۲-۹۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو وہاں سے واضح ہو گا کہ موت کی سزا کا حکم قتل عمد میں ہے، قتل خطا میں نہیں۔

اب سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۸ کے دوسرے حصے کو لیجیئے۔ اس میں کہا گیا ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ۔۔۔ (جسے اسکے بھائی نے کچھ معاف کر دیا ہو)۔ ظاہر ہے کہ اسکا اطلاق اس جرم پر ہو نہیں سکتا جس کی سزا موت ہے یعنی قتل عمد پر نہیں ہو سکتا اس کا اطلاق اسی قتل کے جرم پر ہو گا جس کی سزا کوئی ایسی "شیئی" ہو جسے معاف کیا جا سکتا ہو۔ یہ سزا (دیت) قتل خطا کی ہے۔ قتل عمد کی سزا (موت) میں سے کچھ "معاف کرنے" کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لہذا سورۂ بقرہ آیت ۱۷۸ کو سورۃ النساء کی آیات ۹۲-۹۳ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ:۔

(i) قتل عمد کی سزا موت ہے جس میں سے کچھ معاف کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور

(ii) کچھ "معاف" کرنے کا سوال اسی جرم کے ضمن میں پیدا ہو گا جس کی سزا ایسی ہو جس میں سے کچھ معاف کیا جا سکے۔ اور وہ جرم قتل خطا ہے، قتل عمد نہیں۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قتل عمد میں بھی دیت کی اجازت ہے تو اس سے خدا کے متعلق ایسا تصور پیدا ہو گا جس کی جرأت نہیں کی جاسکتی۔ اس کے متعلق تصور یہ پیدا ہو گا کہ (نعوذ باللہ) اسے ایک حکم قانون بھی متعین طور پر وضع (یا بیان) کرنا نہیں آتا۔ اس نے سورۃ النساء میں بہ لفظ صریح

کہہ دیا کہ دیت، قتلِ خطا میں ہے۔ قتلِ عمد کے لئے ایسا نہیں کہا۔ حالانکہ (بقول فقہ) دیت کی سزا کے لئے قتلِ خطا اور قتلِ عمد میں کوئی تفریق نہیں۔ یہ سزا دونوں میں دی جا سکتی ہے۔ خدا کے بیان کردہ قانون میں یہ نقص تھا جسے فقہ نے دور کر دیا (استغفر اللہ)

جب سنہ ۱۹۸۰ء کے اواخر میں قانون قصاص کا مسودہ عام تنقید کے لئے شائع کیا گیا تھا تو ہم نے (طلوعِ اسلام بابت فروری سنہ ۱۹۸۱ء میں) اس پر تفصیلی تبصرہ کیا تھا۔ اس مسودہ میں جرم قتلِ عمد کی سزا کے سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ :-

(۱) اس میں دیت بھی ہو سکتی ہے۔
(۲) مقتول کے ولی یا اولیاء (وارثوں) کو حق حاصل ہو گا کہ قاتل کو بلا مشروط معاف کر دیں۔
(۳) اس کے ساتھ سودا کر کے اس سے (یا) صلح کر لیں۔

ہم نے یہ لکھ کر کہ یہ تینوں شکلیں قرآن کریم کے احکام کے صریحاً خلاف ہیں۔ اور ان سے جرم قتل کے ارتکاب کے پھاٹک کھل جائیں گے۔ کہا تھا کہ

یہ روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ قتل کے بیشتر محرکات جائیدادوں کی وراثت ہوتی ہے، یا بدقماش عورتیں، اپنے آشناؤں سے مل کر اپنے خاوندوں کو قتل کرا دیتی ہیں۔ کہا جائے گا کہ قانون کی رُو سے، قاتل مقتول کی جائیداد کا وارث نہیں ہو سکے گا۔ لیکن جو لوگ جائیدادوں کے وارث بننے کے لئے قتل کراتے ہیں، وہ خود قتل نہیں کرتے۔ قاتل کرائے پر لئے جاتے ہیں۔ یہی صورت بدقماش عورتوں کی ہوتی ہے۔ موجودہ حالات میں، کرائے کے قاتلوں کو سزائے موت کا خطرہ لاحق ہوتا ہے لیکن جب مقتول کے وارثوں کو، جنہوں نے قتل کرایا تھا، معاف کر دینے کا حق حاصل ہو تو کرائے کے قاتل بلا تکلف مل جائیں گے۔ اگر قاتل کو دیت بھی ادا کرنی ہو گی تو وہ بھی مقتول کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ وہ خود ہی قاتل کے ہاتھوں دیت ادا کر دیں گے اور پھر خود ہی اسے وصول کریں گے۔ علاوہ ازیں کمزور پارٹیوں کو صلح کے لئے مجبور کرنے میں، کیا دشواری پیش آ سکتی ہے؟ اس وقت تو ان کے پاس یہ عذر ہوتا ہے کہ قانون کی رُو سے صلح کی گنجائش نہیں۔ جب قانون اس کی اجازت دے دے گا تو وہ صلح کے لئے بآسانی مجبور کئے جا سکیں گے۔

غور فرمائیے کہ کیا اس سے جرم قتلِ عمد کے ارتکاب کے پھاٹک نہیں کھل جائیں گے۔ قرآن کریم نے جو قتلِ عمد میں نہ دیت کی گنجائش رکھی تھی، اور نہ ہی عفو یا صلح کی، تو اس سے مقصود یہ تھا کہ اس جرم کے ارتکاب کے امکانات ختم نہیں تو بڑی حد تک کم ہو جائیں۔ مجوزہ قانون قرآنِ کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔

عدالت اگر مجرم میں اصلاح کا امکان دیکھے تو اور بات ہے۔ (۲۵/۶۸-۷۰)

عورت کی دیت

اس مسودہ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر مقتولہ عورت ہوگی تو اس کی دیت مردوں کی دیت سے آدھی ہوگی۔

اس پر ہم نے مختصر الفاظ میں یہ تنقید کی تھی۔

یا اللہ! عورت کی جان کی قیمت، مرد کی جان کی قیمت سے نصف! ایسے قوانین وضع کر کے ہم خدا کے حضور کس منہ سے جائیں گے، اسے تو چھوڑ دیجئے، ہم تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے، بالخصوص جب ان قوانین کو اسلامی کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

اس کی سند اور دلیل اس کے سوا کیا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ قرآن تو انسانی نفس (جان) اور نفس (جان) میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اور عورت بھی بالآخر انسان ہی ہوتی ہے۔

یہ مسودہ آج کل بڑے دلچسپ مراحل میں سے گذر رہا ہے۔ اسے اسلامی نظریاتی کونسل نے مرتب کیا تھا۔ صدر مملکت نے اسے، مجلس شوریٰ کے ارکان پر مشتمل ایک سیلیکٹ کمیٹی کے سپرد کیا کہ اس پر غور و خوض کے بعد اسے شوریٰ کے اجلاس میں پیش کرے۔ اس کمیٹی کے مرتب کردہ مسودہ میں منجملہ دیگر امور یہ بھی کہا گیا تھا کہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہونی چاہیئے۔ جب یہ مسودہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں پیش ہوا تو اس شق کی مخالفت میں طوفان برپا ہوگیا۔ سیلیکٹ کمیٹی کے تین اراکین نے کہا کہ وہ اختلافی نوٹ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ قریب چالیس اراکین واک آؤٹ کر گئے۔ تادمِ تحریر (۱۴ اپریل ۱۹۸۴ء) اسے بار دیگر مختلف کمیٹیوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ کوئی مصالحت کی راہ تجویز کریں۔

جس اختلافی نوٹ کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ غور طلب ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

جہاں تک عورت کی دیت کے تعین کے مسئلے کا تعلق ہے ہم نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس موضوع (رقم دیت کے تعین) پر جو دفعہ مرتب کی ہے اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں، اور اس طرح ہم نے عورت کی نصف دیت کے بارے میں اپنی قطعی رائے کا اظہار کیا تھا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی مرتبہ دفعہ کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی دیت کے مسئلہ میں سب سے پہلے جس چیز کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے یہ بنیاد ہے کہ عورت کی دیت کے نصف ہونے کا فیصلہ

خود آنحضرت (صلعم) نے فرمایا تھا جیسا کہ حدیث عمرو بن حزم میں ہے۔
اس حدیث کے مطابق تمام مکاتب فقہ، حنفی۔ مالکی۔ شافعی۔ حنبلی شیعہ جعفریہ اور ابن حزم ظاہری سمیت تمام آئمہ و فقہا اور مجتہدین اس امر پر متفق رہے ہیں اور اس پر چودہ سو سال سے ان (امت) کا تعامل رہا ہے۔

(جنگ لاہور ۷ اپریل ۱۹۸۴)

آگے بڑھنے سے پہلے آپ ذرا رکیئے اور اس اقتباس پر گہری نگاہ ڈالئے۔ اس میں حدیث کا ذکر ہے۔ تمام مکاتب فقہ کا ذکر ہے۔ مختلف فقہا اور مجتہدین کا ذکر ہے۔ چودہ سو سال کے تعامل کا ذکر ہے۔ اگر ذکر نہیں تو خدا کی کتاب کا نہیں۔ حالانکہ (قطع نظر ارشاد خداوندی کے جس کی رُو سے قولِ فیصل کتاب اللہ کا ہوگا) دستورِ پاکستان میں بھی کسی قانون کے اسلامی ہونے کی شرط یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔ لیکن زیرِ نظر قانون میں خاص طور پر احتیاط برتی گئی ہے کہ خدا کی کتاب کا ذکر، اشارۃً کنایۃً بھی نہ آنے پائے! یوں مرتب ہو رہے ہیں آپ کے اسلامی شریعت کے قوانین!

اختلافی نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

رپورٹ میں ابن علیہ اور اصم کے جس قول کو عورت کی پوری دیت کے حق میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے، اس قول کے بارے میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ خود ابن علیہ اور اصم کی کوئی کتاب روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔ یہ قول ان کی طرف منسوب بعض کتابوں میں ملتا ہے لیکن فقہ کی تمام مستند، معتمد علیہ اور ایسی کتابوں میں جن کے مطابق فتویٰ دینا جائز ہے اور کسی فقیہ نے ابن علیہ اور اصم کے قول کو نہ صحیح قرار دیا ہے نہ تسلیم کیا ہے۔

یعنی جن فقہا اور مجتہدین کا قول، ان حضرات کی منشاء کے مطابق ہے، وہ معتمد علیہ بھی ہیں اور مستند بھی۔ جس کا قول ان کے خلاف ہے وہ ناقابلِ تسلیم ہے۔

آگے چل کر کہا ہے

جہاں تک ابن قدامہ کے اس قول کا تعلق ہے کہ خون سب کا ایک جیسا ہوتا ہے تو یہ خود قرآن سے ثابت ہے جیسا کہ آیت میں موجود ہے ان النفس بالنفس .... والجروح قصاص۔ لیکن یہ قاعدہ قصاص کے بارے میں ہے کہ ہر قتل، خواہ وہ عورت کا ہو یا مرد کا، سب کا قصاص لیا جائیگا۔ اور یہاں پر موضوع دیت کا ہے۔ اور یہ تفصیل کہ کن قتلوں میں دیت ہے۔ کتنی رقم کی دیت ہے کس شخص پر اور کب تک دیت ہے یہ تمام تفاصیل احادیث میں آئی ہیں۔

یعنی قرآن نے اگر کہا ہے کہ خون سب کا ایک جیسا ہوتا ہے، تو وہ (معاذ اللہ) کہتا پھرے۔ ہمارا فیصلہ یہی ہے کہ عورت کے خون کی قیمت، مرد کے خون سے نصف ہوتی ہے۔

ہمیں ان حضرات سے کچھ گلہ نہیں۔ ہمیں گلہ ہے ان ارباب اقتدار سے جنہوں نے قانون سازی جیسا اہم فریضہ ان کے سپرد کر رکھا ہے جن کی کیفیت یہ ہے کہ اِذَا قِیْلَ لَہُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں! ہم اپنے اسلاف ہی کا اتباع کریں گے (خواہ وہ کتاب اللہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو)

۵۔ طرزِ حکومت

سوال:۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام نے کوئی خاص طرزِ حکومت متعین نہیں کیا اس لئے ہم جس قسم کا مناسب سمجھیں طرزِ حکومت اختیار کر سکتے ہیں۔ صدارتی نظام، پارلیمانی نظام حتیٰ کہ شاہنشاہیت۔ قرآن مجید کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔

جواب:۔ قرآن مجید نے بے شک کوئی خاص طرزِ حکومت متعین نہیں کیا لیکن اس کے لئے ایک اساسی اصول مقرر کر دیا ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اصول ہے۔ وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے امور مملکت آپس میں باہمی مشورہ سے طے پائیں گے"۔ لہٰذا، جس طرزِ حکومت میں افرادِ امت (قوم) کا مشورہ شامل نہیں ہوگا۔ وہ اسلامی نہیں کہلا سکے گا۔ شاہنشاہیت کو اسی لئے "دین میں حرام" (اقبالؒ) کہا گیا ہے کہ اس میں مشاورت کا شائبہ تک بار نہیں پا سکتا۔ مشاورت کے بھی قرآن نے دو مختلف انداز بیان کئے ہیں۔ ایک رسول اللہؐ کیلئے جو مامور من اللہ سربراہ مملکت تھے۔ ان کے لئے فرمایا: وَشَاوِرْہُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (۳/۱۵۸) "تم ان سے مشورہ کیا کرو۔ اور جب تو کسی فیصلہ پر پہنچ جائے تو پھر خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اس فیصلہ پر عمل پیرا ہو جاؤ"۔ رسول اللہؐ کے بعد کوئی مامور من اللہ نہیں ہو سکتا لہٰذا اس باب میں افرادِ امت سب برابر ہوں گے۔ ان کے لئے کہا کہ امرھم شوریٰ بَیْنَہُمْ۔ ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ اگر کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو دیکھا یہ جائیگا کہ قرآن مجید کا اس باب میں کیا حکم ہے وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ (۴۲/۱۰) یہی اصول اسلامی مملکت اور سیکولر حکومت میں خطِ امتیاز ہے۔ یہاں عجیب تماشہ ہے کہ طرزِ حکومت کی بحثیں تو سب کرتے ہیں، لیکن اساسِ حکومت کی بات کوئی نہیں کرتا۔ اور اساسِ حکومت یہ ہے کہ حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے باقی بتانی اور کی

اب اقبالؒ یہ رہ گیا ہے!

حضرات انبیاء کرامؑ تشریف لاتے، اپنے پیغاماتِ حیات آور اور تعلیمات انقلاب آفریں سے قوم کے جسدِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتے اور اس طرح اسے حیاتِ تازہ عطا کر دیتے۔ ان کے جانے کے بعد ان کے نام نہاد متبعین ان کی اس زندگی بخش تعلیم کو تو نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کر دیتے، اور ان کی طرف عجیب و غریب قسم کی طلسماتی روایات منسوب کر کے، انہیں (معاذ اللہ) توہمات کا مجسمہ اور خرافات کا پیکر بنا دیتے۔

حضور نبی اکرمؐ کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور امت میں حیات آفرینی کا فریضہ ابنائے امت کے سپرد ہو گیا۔ ہمارے دور میں یہ فریضہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ادا کیا۔ وہ تمام عمر ان قوتوں کے خلاف مصروفِ نبرد آزمائی رہے جنہوں نے دینِ خداوندی کو مسدود کر کے امت کو راکھ کا ڈھیر بنا رکھا تھا۔ ملوکیت یعنی انسانوں کی حکومت، خواہ اس کی کوئی شکل بھی ہو، نظام سرمایہ پرستی، خواہ اس کا مظہر کوئی پیکر بھی ہو۔ زمینداری، جاگیرداری، مذہبی پیشوائیت، خواہ وہ ملا ازم کی شکل میں ہو اور خواہ مسلک خانقاہیت کی صورت میں، تقلید، فکری جمود۔ ان تمام محاذوں پر وہ مصروفِ جہاد رہے۔ ان اغلال و سلاسل کی شکست و ریخت کے لئے، ان کے کلام اور پیغام میں اس قدر سامانِ حرب و ضرب ملتا ہے جس کی مثال ہماری صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

لیکن ادھر اقبالؒ کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر، اس قسم کی کوششیں شروع ہو گئیں جن سے اس کی انقلاب آفریں تعلیم امت کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، اور اقبالؒ توہمات کا مجموعہ بن کر سامنے آئے۔ تحریکِ پاکستان تک یہ کوششیں چنداں بار آور نہ ہو سکی تھیں، لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ اکاس بیل کی طرح بڑھنی اور پھیلنی شروع ہو گئیں بایں نمط کہ اب اقبالؒ کا قرآنی شجرِ طیب یکسر نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے (یا ہو رہا ہے) اس کی تازہ مثال ہمارے سامنے، اقبال اکادمی کے مجلہ بابت جنوری ۱۹۸۴ء کے اقبال نمبر میں آتی ہے۔ اس میں قریب پچاس صفحات پر پھیلا ہوا

ایک مقالہ ہے جس کا عنوان ہے "علامہ اقبالؒ کی عقیدت صوفیائے عظام سے" اس میں براہ راست اقبالؒ کی طرف، یا ان بزرگوں کی طرف جن کا عقیدت مند اقبالؒ کو بتایا گیا ہے، ایسے ایسے فوق الفطرت، طلسم آفریں قصے منسوب کئے گئے ہیں، جن کی روشنی میں وہ (اقبالؒ) کسی مزار کا مجاور دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سے چند ایک مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔ (واضح رہے کہ اقبالؒ اکادمی ایک بڑا ذمہ دار ادارہ ہے جو پیغام اقبالؒ کی نشر و اشاعت کے لئے وجود پذیر ہے)۔ وہ اساطیر ملاحظہ فرمایئے۔ حوالوں کے لئے رسالہ مذکورہ کے صفحات دیئے گئے ہیں:۔

(۱) علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک جدِّ امجد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا پیر تھے۔ ان کا نام تھا شیخ اکبر۔ انہیں پیری اس طرح ملی کہ (موضع اسن کھترا (سیالکوٹ) میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے۔ اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے جس کی متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسینؓ کی یادگار ہے۔ اس کی برکت سے آگ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ مخالفوں نے یہ دیکھا تو انہیں یقین ہوگیا کہ فی الواقعہ سید ہیں (ص۱)

(۲) رسالہ کے اگلے دو صفحوں پر علامہ اقبالؒ کی پیدائش سے قبل ان کے والد اور والدہ ماجدہ (مرحومین) کے عجیب و غریب خوابوں کا ذکر ہے۔

(۳) علامہ اقبالؒ کے بھائی شیخ عطاء اللہ پر ایک افتاد پڑی تو علامہ اقبالؒ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حضور منظوم استغاثہ پیش کیا جسے خوشخط لکھوا کر درگاہ کے دروازے پر لٹکایا اور اس استغاثہ کی برکت سے شیخ عطاء اللہ باعزت طور پر بری ہوئے (ص۷)

(۴) دستِ غیب کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مولانا وحید الدین سلیم نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو ان کے پیر حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ نے مولانا وحید الدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا، ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں۔ جب روپیہ کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفہ کو پڑھنا۔ پانچ روپے تمہیں مل جایا کریں گے۔ پیر صاحب سے رخصت ہوکر گھر آئے تو والدہ کو سارا قصہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ گھر میں کچھ نہیں۔ دم نہ دانہ۔ وظیفہ پڑھا گیا۔ تکیہ کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے۔ (جب تک انہوں نے وظیفہ جاری رکھا اسی طرح پانچ روپے ملتے رہے۔ (ص۱۵)

(۵) کرامت کی ایک اور مثال ڈاکٹر صاحب نے سنائی۔ فرمایا۔ سر سید کی طرح ان کے والد

کے گلے میں بھی رسولی تھی۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا کیا کچھ علاج کیا جائے۔ پیر صاحب نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا بھئی، ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی (ص۱۵)

(۶) سرسید کے پوتے، اور علامہ اقبالؒ کے عزیز دوست سر راس مسعود نے بتایا کہ قیام حیدرآباد کے دوران وہ کچھ مشکلات میں گھر گئے۔ ایک ولی کے مزار پر فاتحہ پڑھی تو غیب سے آواز آئی کہ اس درخت کی تین پتیاں کھا لو۔ مشکلات حل ہو جائیں گی وہ پتیاں کھائیں تو مشکلات حل ہو گئیں (ص۱۷)

(۷) علامہ کے فرزند، جاوید اقبالؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات حضرت علامہؒ بخار کے مریضوں کو پیپل کے پتوں پر قرآنی آیات قلم سے لکھ کر دیتے تھے جس کے چاٹنے سے مریض کا بخار اتر جاتا تھا۔ (ص۱۸)

(۸) ایک دفعہ محترم راغب احسن کا خاندان مصائب و آلام کا شکار ہو گیا تو علامہ نے انہیں لکھا کہ آپ کو سورۃ الرحمٰن کا ورد ہر روز کرنا چاہیئے۔ گھر کے سب لوگ پڑھا کریں تو اور بھی بہتر ہے (ص۱۹)

(۹) ص۱۹ پر لکھا ہے کہ حضرت علامہ خود بھی مستجاب الدعوات اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک عقیدت مند، ڈاکٹر عبدالحمید ملک ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میری شادی کو بہت عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ دعا فرمائیں! چنانچہ آپ کی دعا سے وہ اولاد کی نعمت سے سرفراز ہوئے (ص۱۹) حضرت علامہؒ کی وفات کے بعد ایک دفعہ وہ بچہ بیمار ہو گیا تو ان کے مزار کی مٹی چٹانے سے وہ اچھا ہو گیا (ص۲۰)

(۱۰) ایک دفعہ ستاروں کی تاثیر کی بات ہوئی تو حضرت علامہ نے فرمایا کہ ستارے ذی روح کرے ہیں۔ ستاروں کی حرکات نقص سے خالی ہیں۔ روحیں ستاروں میں قیام کرتی ہیں۔۔۔۔ ستاروں نے بعض افراد کو اپنی طرف کھینچا۔ انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ یا یوں کہیئے کہ بعض انسانوں کا خیال اس طرف گیا کہ آسمان کا سفر کریں ستاروں میں پہنچیں اور ان میں گھوم پھر کر واپس آجائیں (ص۲۳)

(۱۱) تذکرۂ غوثیہ کے مصنف حضرت شاہ گل حسن قادریؒ کے ساتھ اپنی ملاقات کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے بیان فرمایا کہ انہوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ میں عرصہ سے سنگ گردہ کا مریض ہوں۔ میرے لئے دعا کریں۔ انہوں نے دعا کی۔

ص۱ امریکہ کے خلانوردوں کی طرح نہیں بلکہ شیخ اکبر ابن عربیؒ کی طرح!

ٹرین میں علامہ پیشاب کے لئے گئے تو بیقری از خود خارج ہوگئی (ص ۳۹)

(۱۲) ص ۱۴ پہ لکھا ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد حضرت علامہ کو مجذوبوں سے خاص عقیدت ہوگئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں لاہور کی ایک مجذوبہ کا بہت چرچا تھا جو سلطان کی سرائے میں قیام پذیر تھی۔ حضرت علامہ نے مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھا کہ وہ کسی دن اس مجذوبہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور مہاراجہ کا پیغام بھی ان تک پہنچائیں گے۔ (ص ۱۴)

یہ ہیں چند ایک مثالیں ان قصوں کی جو علامہ اقبالؒ کی طرف بالواسطہ یا بلاواسطہ منسوب کی گئی ہیں۔ حضرت علامہؒ نے اپنی مشہور نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ، میں کہا ہے کہ ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا کہ امتِ محمدیہ کو دین سے بیگانہ رکھنے کا طریق یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے   پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ہم پوچھنا چاہتے ہیں اقبالؒ اکادمی کے ارباب ذمہ سے کہ کیا اس قسم کے مقالات کی اشاعت ابلیس کی اس سازش کے کامیاب بنانے میں ممد و معاون نہیں ہوتی؟ جب آپ کے قارئین یہ دیکھیں گے کہ یہ قصے، بھنگڑ خانے کے کسی مست کی بڑیں نہیں بلکہ انہیں علامہ اقبال جیسے مفکرِ اسلام کی تائید و توثیق حاصل ہے، تو وہ مزاج خانقاہی میں پختہ تر نہیں ہوجائیں گے؟ کیا یہ فکر و پیغام اقبال کی نشر و اشاعت ہے یا انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ پھینکنے کی سعی و کاوش!

کہا جائیگا کہ جب اقبالؒ کی زندگی میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں تو ان کے اظہار پہ کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ لیکن اظہار، اور اظہار کے انداز میں فرق ہے اور اسی فرق کو نظر انداز کر دینے سے، زہر تریاق اور تریاق زہر بن جاتا ہے۔ قائداعظمؒ کی سیاسی زندگی کے آخری دور میں، ان پہ کسی نے اعتراض کیا تھا کہ آپ تو کٹڑ نیشنلسٹ تھے۔ اب دو قومی نظریہ کے علمبردار کیسے بن گئے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا تھا کہ میں کبھی پرائمری کلاس میں بھی پڑھتا تھا! اقبالؒ کی طرف منسوب ان قصوں کا بھی جواب یہ ہے کہ یہ اس زمانے، یا ان لمحات کی باتیں ہیں جب قرآنی حقائق سے وہ متعارف نہیں ہوئے تھے یا وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ وہ خدا کے رسول نہیں تھے۔ انسان تھے۔ ایک تو انسانی فکر ارتقائی مدارج طے کرتی آگے بڑھتی ہے۔ دوسرے انسان میں سہو و خطا کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے غلط اور صحیح۔ حق اور باطل کا معیار خدا کی کتاب کو قرار دیا ہے۔ ان کا قولِ فیصل ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

انہوں نے خود (اپنی پہلی مثنوی میں) بدرگاہ ربّ العزت عرض کیا ہے کہ جو کچھ میں نے

کہا ہے اگر وہ تیری کتاب کے مطابق ہے تو اسے شرفِ قبولیت عطا فرما۔ جو اس کے خلاف ہے اس کے لئے میں اپنے کو بطور مجرم پیش کرتا ہوں۔ جو کچھ اقبالؒ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کے پرکھنے کے لئے بھی یہی معیار اختیار کرنا چاہیئے۔ پرویز صاحب نے اپنی کتاب (تصوف کی حقیقت) میں، اس قسم کے متعدد واقعات لکھے ہیں لیکن اس میں انداز وہی اختیار کیا گیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تریاق، زہر نہیں بننے پایا۔ اس میں اقبالؒ پیامبر حیات اور داعئ انقلابِ قرآنی کی حیثیت ہی سے سامنے آتا ہے۔

لیکن جس طرح اقبالؒ کو پاکستان میں پیش کیا گیا اور کیا جا رہا ہے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ایک سازش ہے، دانستہ یا نادانستہ۔ ہم نے قرآن کے ساتھ یہی کیا تھا کہ اس کی تعلیم اور پیغام کو چھپائے رکھا اور اسے تعویذوں، ورد وظیفوں، ناظرہ تلاوتوں اور تسبیحوں کی شکل میں خوب خوب ابھارا۔ یہی کچھ یہاں اقبالؒ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ جن ہلاکت آفریں تصورات، معتقدات اور مسالک کو ختم کرنے کے لئے آئے تھے، ہم انہیں نہ صرف دوبارہ زندہ کر رہے ہیں۔ بلکہ پروان چڑھا رہے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ کہ خود انہی کے نام سے! بدنصیب قوموں کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔

۱؎ جو لوگ اقبالؒ کا مسلک خانقاہیت پیش نہیں کرتے وہ ان کے مابعد الطبیعاتی فلسفہ پر بحثیں شروع کر دیتے ہیں۔ (۔۔۔ حالاتِ موجودہ) یہ بھی قوم کو بے نتیجہ عمل بنانے کا بڑا مؤثر کارگر حربہ ہے۔ اقبالؒ نے خود اس سے محتاط رہنے کو کہا ہے

تصوف کی حقیقت

پرویز صاحب کی وہ بصیرت افروز تصنیف جس میں ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ تصوف کیا ہے اور قرآن کریم کی رو سے اس کی حقیقت کیا۔ اور دوسری طرف یہ واضح کیا گیا ہے کہ علامہ اقبالؒ کا اس باب میں مسلک کیا تھا اور وہ کون کون سے مراحل سے گزرے تھے۔ اس کتاب نے دنیائے فکر و نظر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

(قیمت فی جلد (مجلد) -/۲۵ روپے۔)
(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

ناقابلِ برداشت :

بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی کے خادم شگفتہ نمائندہ، چودھری نجابت خان کی وفات کے بعد، ان کے بڑے صاحبزادے شہریار نے بڑی ہمت سے گھر کا بوجھ بھی سنبھال لیا تھا اور اس تعاون کو بھی بدستور جاری رکھا تھا جسے ان کے والد مرحوم نے قابلِ رشک طریق سے قائم کیا تھا۔ اب اس خبر نے کلیجہ شق کر دیا کہ یہ سعادت مند نوجوان بھی اچانک انتقال کر گیا۔ اس سے مرحوم کے اہلِ خانہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور تحریکِ طلوعِ اسلام کو بھی صدمہ پر صدمہ اٹھانا پڑا۔ ہم مرحوم کے پسماندگان اور بزم راولپنڈی کے اراکین کے ساتھ اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی برداشت کی توفیق عطا فرمائے۔ بزم راولپنڈی کے نمائندہ سے درخواست ہے کہ ہماری یہ تعزیت مرحوم نجابت خان کے چھوٹے صاحبزادے اور ان کی عمر رسیدہ والدہ تک پہنچا دیں۔

ایک تصحیح

طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۸۴ء سطر ۱۴ پر "دیوبند کی طرف سے (من حیث الکل) کی جگہ "باستثناء چند" پڑھا جائے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۲۰ روپے
مکمل سیٹ مجلد -/۸۰ روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے مطلا جلدوں میں قیمت جلد اول تازہ ایڈیشن -/۷۵ روپے
جلد دوم سوم چہارم فی جلد -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یوم اقبال ۱۹۸۴ء

خصوصی خطاب

خلقِ خدا کی گھاتیں رند و فقیہہ و میر و پیر

پرویز

خلقِ خدا کی گھات میں رِند و فقیہہ و میر و پیر

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

آج کی تقریب اس جلیل القدر، نادرۂ روزگار ہستی کی یاد میں منعقد کی گئی ہے جس کا نام ہمارے محسنینِ ملت کی فہرست میں سرِعنوان آتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اربابِ دانش و بینش کو فکری اور تخیلاتی افق پر ایک جہانِ نو سے روشناس کرایا۔ اسلامیانِ ہند و پاک کو اس الہیاتی حقیقت سے متعارف کرایا کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے جس کا احیاء اور قیام صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے اور پھر اس آزاد مملکت کے اساسی خط و خال متعین کر کے اس کے حصول کی راہیں متعین کیں۔ آج اگر ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہوتا ہے تو یہ بنیادی طور پر اسی کی نگہِ دوررس اور حقیقت شناس کا تصدق ہے، اور اگر اس خطۂ زمین میں کبھی صحیح اسلامی (قرآنی) مملکت کا قیام عمل میں آیا، تو وہ بھی اسی قرآنی مفکر کے تصورات کی رہینِ منت ہوگی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر، یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر ہو یا مفکر، وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مستغرق رہتا ہے اور اسے دنیائے ممکنات (انسان کی عملی زندگی) سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس شاعر اور مفکر کی کیفیت اس سے مختلف تھی۔ اس کی فکر کی ابتداء دنیائے ممکنات کے سنوارنے سے ہوتی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ:

> اگر ز سہل ہو تو ل یکھ یہ زمین کے ہنگامے بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

یہ اس لئے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ خدا کی کتاب تھی، جس نے مومن کی زندگی کے سلسلہ میں اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً پہلے کہا ہے اور فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اس کے بعد ($\frac{2}{201}$)۔ بالفاظِ دیگر وہ انسان کی موجودہ دنیا سنوارنے سے اس کی اخروی زندگی سنوارتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک اخروی زندگی موجودہ زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ حیات ایک جوئے رواں ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ اس لئے جیسی یہاں کی زندگی، ویسی

وہاں کی زندگی۔ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲)
جو یہاں اندھا ہے، وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

روٹی کی اہمیت

دنیاوی زندگی کا مدار سامانِ زیست پر ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں رزق کہا جاتا ہے، اور ہمارے ہاں اسے "روٹی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے رزق یا روٹی کو کسقدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ اس میں جہاں سے کس کا جی چاہے پیٹ بھر کر کھائے۔ یعنی اس میں رزق کے معاملے میں "میری اور تیری" کی تفریق نہ ہو۔ اس کا دسترخوان تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں بچھا ہو جہاں سے ہر شخص، اپنی ضرورت کے مطابق، بلا تکلف لے لے۔ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی: اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى (۲۰/۱۱۸) وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۹)۔ "اس میں بھوک، پیاس اور رہائش کا سامان ہر ایک کے لئے یکساں موجود ہوگا، کوئی اس سے محروم نہیں ہوگا۔" یہ تو رہی جنت میں آدم کی زندگی۔ حضرت ابراہیمؑ جب خدا کے گھر کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو خدا سے پہلی دعا یہ مانگی کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (۲/۱۲۶)۔ "وہاں کے رہنے والوں کے لئے سامانِ رزق فراہم کیا جائے۔" اس نے اقوامِ عالم کے لئے زندگی کی جن آسائشوں کا ذکر کیا ہے، ان میں رزق سرِ فہرست ہے۔ سورہ نحل میں تمثیلاً ایک بستی کا ذکر ہے جو نعماءِ خداوندی سے متمتع تھی اس کے متعلق کہا کہ يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (۱۶/۱۱۲) "اس کی طرف ہر گوشے سے سامانِ زیست چلا آتا تھا۔" اس نے قریش کو جن انعاماتِ خداوندی کی یاد دلائی تھی۔ اس کے متعلق کہا تھا: اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۴) "وہ روٹی کی طرف سے مطمئن، اور خطرات سے مامون تھے۔" اس نے بھوک اور خوف کو خدا کا عذاب بتایا ہے۔ جس بستی کا تمثیلی ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ اسے سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل تھیں، اس کے متعلق کہا ہے کہ جب اس نے کفرانِ نعمت کیا تو: فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) "اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو گیا۔" جہاں جنتی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس میں ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہوگی، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ "جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتے گی، اس کی روزی تنگ ہو جائیگی، وہ بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو جائیگی۔"

اور اس کے بعد ہے۔ وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) "جس کی روزی یہاں تنگ ہوگی، وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائیگا"۔

رزقِ کریم

لیکن قرآنِ کریم نے رزق کے ساتھ ایک شرطِ عائد کی ہے۔ یعنی رزقِ کریم باعزت روٹی۔ روٹی تو ہر طریق سے حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن ایک روٹی وہ ہے، جسے عزت بیچ کر حاصل کیا جاتا ہے، اور ایک وہ جس میں عزت و آبرو برقرار رہتی ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجے میں جو مملکت حاصل ہوتی ہے، اسے استخلاف فی الارض، یعنی اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ (وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ... ۲۴/۵۵) اور اس مملکت میں جو رزق حاصل ہوتا ہے، وہ اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارتا ہے۔ (فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۲۲/۵۰)۔ "جو لوگ ایمان اور اعمالِ صالح کے حامل ہوں گے، انہیں خطرات سے حفاظت بھی ملے گی اور رزقِ کریم۔ باعزت روٹی بھی"۔ اسے اس نے رزقِ طیب بھی کہا ہے۔ یعنی خوشگوار زندگی، عیش اور پاکیزہ رزق۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعماء کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ (وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۱۰/۹۳) بنی اسرائیل کو تمکن عطا کیا اور رزقِ طیب۔ یہی مومنین کے متعلق کہا۔ مہاجرین اور مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۴) "یہ سچے اور پکے مومن تھے۔ انہیں خطرات سے حفاظت اور رزقِ کریم حاصل تھا"۔ اس کو اکلِ حلال کہا گیا تھا۔

اقبالؒ نے قرآنِ کریم کے اس بنیادی نکتہ کو پالیا تھا، اور حیرت ہے کہ اسے اس نے ابتدائی عمر ہی میں پالیا تھا۔ اس نے کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے دو تین سال بعد جو اپنی سب سے پہلی کتاب تصنیف کی، اس کا موضوع تھا علم الاقتصاد وہ فلسفہ کے طالبعلم تھے۔ اقتصادیات ان کا مضمون نہیں تھا، لیکن ان کی نگاہ میں معاشیات کی اس قدر اہمیت تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے اسی موضوع کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ جب ان کی عمر تیئیس چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے کہا تھا۔

اقبالؒ اور غریبوں کی آہیں

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے

ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی حیاتی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔" (اقبالؒ اور قرآن صفحہ ۱۷۸)

یہ ایک فلسفہ کے طالب علم، نوجوان کے احساسات ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان کا سینہ اسی زمانے میں غریبوں اور مفلسوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات سے کس قدر گداز تھا۔ اس کے بعد وہ حصولِ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کے خونچکاں، انسانیت کش مظاہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی کے بعد انہوں نے ۱۹۱۱ء میں علیگڑھ میں وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کی صدائے گونجت آج تک برصغیر ہندوپاک کے در و دیوار سے سنائی دیتی ہے۔ (مولانا) ظفر علی خاں (مرحوم) نے اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ ملت بیضا پر عمرانی نظر۔ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:

ملت بیضا پر عمرانی نظر

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہو گا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کے لئے ترستے ہوئے بچوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی، جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں

کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا ٹوٹتی ہو گی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُٹھ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پسارین۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ عمر بھر بھوک اور افلاس کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ اس کا علاج قرآن کا معاشی نظام تھا جس کا قیام اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور عطا فرمایا تھا۔ اپنی آزاد مملکت اور اس میں رزقِ کریم، باعزت روٹی ہر ایک کے لئے۔ اقبالؒ کا ابلیسی نظامِ سرمایہ داری کیخلاف جہاد اس مقصد کے حصول کے لئے تھا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد محنت کش طبقہ کا استحصال (EXPLOITATION) ہے بانگِ درا میں ان کی زہرہ گداز نظم "خضرِ راہ" کا ایک گوشہ اس استحصال کے خلاف نعرۂ انقلاب ہے۔ اس میں اقبالؒ کے سوال کے جواب میں "خضر" کہتا ہے:۔

بندۂ مزدور

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا؟ ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکوٰۃ
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

العفو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے اسی دولت کے بل بوتے پر سرمایہ دار دوسروں کی محنت کے ماحصل کو چھین لیتا ہے۔ قرآن کی زبان میں فاضلہ دولت کو العفو کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے نظام میں العفو کسی کے پاس نہیں رہتا۔ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ط (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کسقدر دوسروں کی ضرورت کے لئے دے دیں کہو کہ جس قدر تمہارے

اپنی ضرورت سے زائد ہے، سب کا سب"۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کے پاس فاضلہ دولت رہے گی نہیں، تو نظام سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گا۔ روس میں جب کمیونزم کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف انقلابی نعرہ تھا۔ اقبالؒ نے اس سے محسوس کیا کہ زمانے کے تقاضے، شاید قرآن کے معاشی نظام پر پڑے ہوئے پردے اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم	بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر	کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں	اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کمیونزم کا سقم

کمیونزم، نظام سرمایہ داری کے خلاف بہ بنۂ آواز تھی۔ لیکن ذرا آگے چل کر اقبالؒ کی نگہ حقیقت شناس نے دیکھ لیا کہ کمیونزم کے فلسفہ کی رُو سے وہ جذبۂ محرکہ میسر نہیں آسکتا جو العفو کے بارگراں کا متحمل ہو سکے، اس لئے روس کا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے روس کو اس سے متنبہ کیا اور کہا۔

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے	جستۂ او را اساسِ محکمے؟

لینن خدا کے حضور

یہ اساسِ محکم قرآنی نظام میں مل سکتی تھی۔ چونکہ قرآنی نظام کا قیام، نظامِ سرمایہ داری کا تختہ الٹنے کے بغیر ممکن نہ تھا اس لئے علامہ اس کے خلاف، مختلف اسالیب و انداز سے مستیزہ کار رہے۔ ان میں سب سے زیادہ دلکش انداز وہ ہے جسے بالِ جبریل کی دو تین مربوط نظموں میں اختیار کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ لینن کو بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، وہ خدا سے ان سوالات کے جواب مانگتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ہیں۔ وہ خدا سے کہتا ہے کہ ہمیں تو خدا کے منکر، ملحد اور بے دین کہا جاتا ہے۔ لیکن میں، لیکن اب یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ:۔

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟	وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی	مغرب کے خداوند، درخشندہ فلزات

اہلِ مشرق، یورپ کے حکمرانوں کے پرستار ہیں، اور اہلِ یورپ دولت کے پرستار۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ انسان کہاں بستے ہیں جو تیرے پرستار ہیں؟ مجھے تو وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

لینن اقبالؒ نے لینن کے مکالمے کے پردہ میں ایک بیباک حقیقت کو عریاں کیا ہے۔ یعنی اِس حقیقت کو کہ اِس وقت دنیا میں خدا کی حکمرانی کہیں بھی نہیں۔ مشرق کی محکوم قوموں کے خدا، مغرب کے حکمران ہیں، اور مغرب کے حکمران، دولت کے محکوم اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ کہیں کہا ہے کہ ـــ نہ دہر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری۔ کہیں یہ کہ ـــــــ یہ تیرے کافر و مومن تمام زناری۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں:-

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اس اعتراض کے بعد پھر لینن کی طرف آیئے وہ خدا سے کہتا ہے:-

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر یہ حکومت پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

اس کے بعد وہ ذرا کھل کر بات کرتا ہے اور کہتا ہے:-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ:-

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تیری منتظر یومِ مکافات

فرشتوں کا گیت یہ سوال فرشتوں کے دل کو بھی وقفِ اضطراب کئے ہوئے تھا جسے حضرتِ علامہ اگلی نظم میں سامنے لائے ہیں۔ قرآن میں قصۂ آدم کے ضمن میں (جو درحقیقت تمثیلی انداز میں خود آدمی کی داستان ہے) کہا گیا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲/۳۰) "میں دنیا میں ایک صاحبِ اختیار مخلوق پیدا کر رہا ہوں"۔ اس پر فرشتوں نے کہا: اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ ـــ بار الٰہا! کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو وہاں خونریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی! جواب ملا۔ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰) ـــ "ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے"۔[1]

یہ سن کر فرشتے خاموش ہو گئے، خاموش تو ہو گئے، لیکن دل میں یہ کھٹک رہی کہ دیکھیں اس مخلوقِ جدید میں کون سے جوہر پنہاں ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے، صرف خدا جانتا ہے۔ اس کے لئے وہ تاریخِ انسانیت کا مشاہدہ کرتے رہے، لیکن، نہ صرف یہ کہ انہیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، دورِ حاضر میں پہنچ کر انسان کی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں

---

[1] ان امور کی وضاحت میری کتاب مطالب الفرقان جلد دوم ..... میں ملے گی۔

نے انتہائی شدت اختیار کر لی۔ اس پر فرشتوں کا پیمانۂ ضبط لبریز ہو گیا، اور انہوں نے جرأت کر کے کہہ ہی دیا کہ "حضور کا ارشاد بجا: اِنِّی اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" لیکن واقعہ یہ ہے کہ:[1]

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گر ازل تیرا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

انسان سازی کے تخلیقی مراحل

قرآن کریم کا مقصود و منتہیٰ ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما ہو کہ وہ ایسا انسان بن جائے جو مشیتِ ایزدی کے معیار پر پورا اترے۔ لیکن وہ انسان کو اس مقام تک انقلابی طریق سے نہیں، ارتقائی انداز سے پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ارتقائی انداز سے منازل بڑی سست رفتاری سے طے ہوتی ہیں۔ عجلت پسند انسان اس آخری منزل کو اپنے سامنے جلد دیکھنا چاہتا ہے، اور نظامِ فطرت کی آہستہ خرامی سے جھنجلا اٹھتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر متنوع انداز سے بیان کیا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا — وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

اور کبھی بارگاہِ خداوندی میں یہ پر سوز گلہ کرتا ہے کہ

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا — کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

فرشتوں کی وہ شکایتِ رنگیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، در اصل خود انسان کے قلبِ مضطرب کی بیساختہ دھڑکن ہے کہ یہ منازل برق رفتاری سے طے کیوں نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر باطل نظام کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد میں تخریب مضمر ہوتی ہے۔ لیکن وہ رفتہ رفتہ اس مقام کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کی رفتار تو بڑی سست ہوتی ہے، لیکن جب وہ آخری لمحہ آجاتا ہے تو وہ نظام اور وہ قوم، جو اس باطل نظام کی حامل ہوتی ہے، اس طرح تباہ و برباد ہوتے ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن اپنے اس

[1] اس نظم میں جو کچھ فرشتوں کی زبان سے کہا گیا ہے، وہ درحقیقت انسان کے موجودہ معاشرہ کی بے نقاب تصویر ہے۔

دعویٰ کی صداقت کی شہادت میں اقوام سابقہ کے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ان سے خود اندازہ لگا لو کہ باطل کے تخریبی نظام کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ قوم ثمود کے متعلق کہتا ہے کہ اس کے سرغنوں نے زمین اور اس کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ جما رکھا تھا کہ غریبوں اور کمزوروں کے مویشی پانی پینے تک کو ترس جاتے تھے۔ انہیں بہتیرا سمجھایا لیکن وہ اپنی اس مستبدانہ روش سے باز نہ آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا (۹۱/۱۴)۔ خدا نے، اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بناء پر ان پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہو گئی۔ غریب اور امیر کا امتیاز مٹ گیا۔ طبقاتی تقسیم ختم ہو گئی۔ وہ، قوم مدین کی داستان کے ضمن میں کہتا ہے کہ ان کی تجارت سراسر فریب کاری تھی جس سے وہ غریبوں کو لوٹتے تھے۔ جب وہ اس سے باز نہ آئے تو ان کی بستیاں اس طرح برباد ہو گئیں: كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۱۱/۹۵) "گویا ان میں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا"۔ وہ قوم لوط کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲)۔ "اس کی بلندیاں، پستیوں میں بدل گئیں"۔ وہ ہر ظالم قوم کے انجام کے متعلق کہتا ہے: فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶/۴۵)۔ ان کی جڑیں تک کٹ جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے: وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸/۵۸)۔ "کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں، لیکن چونکہ تقسیم رزق کا نظام ظالمانہ تھا، اس لئے وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے"۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات ان کی بربادی کے نوحہ خواں ہیں۔ ایک آیت میں ان کی تباہی کی ایسی مثال دی ہے جس سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ کہا کہ وہ اپنی بربادیوں کو دیکھ کر چیختے چلاتے رہے، لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۵) تا آنکہ وہ قوم ایسی ہو گئی جیسے کٹا ہوا کھیت ہو، یا بجھا ہوا شعلہ۔

باطل کا انجام

فرمانِ خدا

خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے باطل نظام کی حامل قوموں کا یہی انجام ہے جسے اقبالؒ نے انتہائی اثر انگیز محاکاتی انداز میں فرشتوں کے نام "فرمانِ خداوندی" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ کہا کہ خدا نے فرشتوں کی شکایت سن کر کہا ؎

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو۔
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کچھ عرصہ پہلے، کمیونسٹ نوجوان "گھیراؤ۔ جلاؤ" کے اپنے تخریبی پروگرام کی تائید میں اقبالؒ

کا یہ شعر گلی گلی، کوچے کوچے گاتے پھرا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ دیکھئے! اقبالؒ جیسا مفکر بھی جلانے، مٹانے کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں کون بتاتا کہ اقبالؒ جلانے مٹانے کی تلقین نہیں کرتا، وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے باطل نظام کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے کہ جس قوم میں ظلم و استبداد اس حد تک پہنچ جائے کہ کاشتکار سال بھر محنتِ شاقہ سے اپنا لہو پسینہ ایک کر دے، لیکن اس کی فصل کو زمیندار اٹھا کر اپنے گھر لے جائے، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جس فصل سے کاشتکار کے بچوں کو محروم کیا گیا تھا، خود زمیندار اور اس کے بچے بھی اس سے محروم رہ جایا کرتے ہیں۔ تباہی و بربادی کا ایسا بے پناہ سیلاب آتا ہے جو ان سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی پُرکاری

فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی کے ایک حصے کو آپ دیکھ چکے۔ اس کے بعد اگلے حصے میں اقبالؒ نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام مذہبی پیشواؤں کی خدا فریبیوں کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے۔ جابر حکمران اور خون آشام سرمایہ دار، غریبوں اور کمزوروں کو کچلتے چلے جاتے ہیں، اور مذہبی راہنما انہیں تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ حکومت اور دولت خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں وہ جسے چاہے امیر بنا دے اور جسے چاہے فقیر کر دے۔ خدا کی مرضی کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف احساسِ شکایت پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان حاکموں اور سرمایہ داروں کو اس دنیا میں یہ کچھ مل رہا ہے، تمہیں آخرت میں جنت عطا ہو گی۔ وہ اپنے اس قسم کے سحر کار وعظوں اور سامراجی نصیحتوں سے غریبوں اور مظلوموں کو افیون پلاتے رہتے ہیں۔ مستبد نظامِ ملوکیت اور خون آشام نظامِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کیا جائے۔ اس لئے فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی میں کہا گیا:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو
"حق را بسجودے صنماں را بطوافے" — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

آپ اقبالؒ کے پیغام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے، وہ آمریت اور سرمایہ داری کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کو بھی انسانیت کے لئے باعثِ عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ اُمت کی تباہی کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و مُلّا و پیر

دوسرے مقام پر کہا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری   اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

اصل یہ ہے کہ ملوکیت کا استبداد اور سرمایہ داری کا استحصال پنپتا ہی مذہبی پیشوائیت کی مقدس سحر کاریوں کے بل بوتے پر ہے۔

نظام زمینداری

اقبالؒ نظام سرمایہ داری کو کاروباری طبقہ تک محدود نہیں رکھتا وہ نظام زمینداری کو بھی اسی کا جزو قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے متعلق فرمایا کہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعۂ رزق ہے۔ اس لئے اسے تمام افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بنیادی حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورہ واقعہ کی چند آیات میں اسے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے:۔

تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے۔ اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کی رو سے۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے، اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اُگاتا ہے؟ کیا ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ہوتا ہے؟ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ($\frac{56}{63-64}$)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی کا ہی نہیں، خود تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانون ربوبیت ایسا کرتا ہے؟ ($\frac{56}{68-69}$)

اس کے بعد کہا کہ تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو کہ کیوں کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو پوشیدہ کر دینا، تمہاری کارِ یگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ($\frac{56}{71-72}$)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی یہ تمام کائناتی مشینری پر غور کرو کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظام خداوندی کا کس قدر۔ تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہرحال اسی نتیجے پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا، اس کے ماحصل میں تمہارا حصہ صرف تمہاری محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے، کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو

سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳) یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔

اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بالِ جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے، جس کا عنوان ہے:۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰہ!

اور نظم یہ ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں! (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۱)

ظاہر ہے کہ جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، تو نہ کوئی شخص زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع جسے زمین بٹائی یا پٹہ پر دی جائے۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ کا ایک فیصلہ حقیقت ثابتہ ہے۔ صحاح ستہ کے ایک مجموعہ، ابوداؤد، میں حضرت ابن ابی نعیمؓ کی ایک روایت ہے کہ

مزارعت

رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گزر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔

(شاہکارِ رسالت صفحہ ۳۸۲)

ربٰوا کا مفہوم

یہاں حضورؐ نے فرمایا کہ مزارعت بھی سودی کاروبار یعنی ربٰوا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ربٰوا کسے کہتے ہیں۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں عربوں میں "سرمایہ داری" کی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ اس کی بجائے ربٰوا کی اصطلاح عام تھی۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ ربٰوا سے مراد نظامِ سرمایہ داری ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) معاوضہ محنت کا ہے۔ اس کے برعکس نظامِ سرمایہ داری میں معاوضہ سرمایہ، (CAPITAL)

یعنی روپے کا ہوتا ہے۔ لہٰذا، اسلامی نظام اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں مختلف جرائم کی سزائیں مذکور ہیں لیکن ربوٰا کے متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ، فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (۲/۲۷۹) اسے خدا و رسولؐ کی طرف سے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھو، بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے نظامِ ربوٰا اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ یعنی جس طرح اسلام اور نظامِ ملوکیت یکجا نہیں ہو سکتے، اس طرح اسلام اور نظامِ سرمایہ داری بھی یکجا نہیں رہ سکتے۔ جب کہا کہ تم اس سے باز آجاؤ، تو اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ (۲/۲۷۹) "تم صرف اپنا اصلزر واپس لے سکتے ہو، اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لے سکتے کہ وہ ربوٰا ہوگا" اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے۔

۱۔ اسلام اور نظامِ سرمایہ داری ایکدوسرے کی ضد ہیں۔

۲۔ نظامِ سرمایہ داری کے معنی ہیں، محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا معاوضہ لینا، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں ربوٰا کی تین شکلیں رائج تھیں۔

(i) دست بدست (ذاتی) قرضوں پر سود۔ قرآن کریم نے یہ کہکر اسے ختم کر دیا کہ تم صرف اپنا اصلزر واپس لے سکتے ہو، اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں، حتیٰ کہ اگر مقروض تنگدست ہو تو اصلزر بھی چھوڑ دو تو بہتر ہے (۲/۲۸۰)

(ii) زمین کو بٹائی یا پٹہ پر دینا پہلے اسے ربوٰا قرار دیکر ناجائز ٹھہرا دیا اور جب زمین مملکت کی تحویل میں لے لی گئی تو اس قسم کی کوئی شکل باقی نہ رہی۔

(iii) عرب، بالخصوص قریش، تجارت پیشہ بھی تھے، اور لوگ دوسروں کے کاروبار میں روپیہ لگا کر، نفع میں شریک ہو جاتے تھے۔ قرآن کریم نے اسے بھی ربوٰا قرار دے دیا۔ فرمایا

مضاربت

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ (۳۰/۳۹)
"جو روپیہ تم دوسروں کے مال میں شامل کر دیتے ہو کہ وہ بڑھتا رہے، تو یہ ربوٰا ہے، جو اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا"

اس طرح مضاربت یا مشارکت کو بھی ختم کر دیا۔ المختصر اس نے حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) کہہ کر ربوٰا کی ہر شکل کو حرام قرار دے دیا۔ اور اس جرم کی سنگینی کو یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ اس کے مرتکب اور کفار ایک ہی جہنم میں اکٹھے ہوں گے۔ (۳/۱۳۰)

اس طرح اس معاشرہ میں رزق، کریم اور طیب ہو گیا۔ یعنی قرآن کی رُو سے وہی رزق کریم اور طیب ہے جسے اپنی محنت سے حاصل کیا جائے۔ (جو محنت کرنے سے معذور ہو،

اس کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوگی) ربٰوا کے ذریعے رزق حاصل کرنے والا چونکہ محنت نہیں کرتا، اس لئے اس کے تو اسئے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ اس میں محنت کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی نہیں رہتی۔ یہی وہ رزق ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

محنت کر کے کمانے کی صلاحیت، ربوا سے، مفلوج ہو جاتی ہے اور ہوس تد اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر وقت مضطرب وبیقرار ادھر ادھر مارے مارے پھرتا رہتا ہے۔
كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲/۲۷۵) جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔

یہ تھا دورِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی اسلامی مملکت کا نظام، جس میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا تھا، اور ہر فرد کو رزقِ حلال میسر تھا، یعنی عزت کی روٹی۔

دورِ ملوکیت

اس کے بعد ہمارا دورِ ملوکیت آ گیا، اور (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ مذہبی پیشوائیت بھی در آیا۔ اور چونکہ خود مملکت غیر اسلامی تھی، اس لئے وہ سب کچھ جسے قرآن نے ناجائز اور حرام قرار دیا تھا، جائز اور حلال قرار پا گیا۔ صرف اس کا نام بدلا گیا۔ اس کے لئے مذہبی پیشوائیت نے جواز کی راہیں ہموار کر دیں۔ قرآن مجید نے دولت جمع کرنے والوں کے لئے عذاب جہنم کی وعید سنائی تھی، یہ تہدید اس شدت اور تکرار سے آئی تھی کہ ان آیات کی تنسیخ تو کجا، تاویل تک ممکن نہ تھی۔ اس کے جواز کی ایک اور راہ تراشی گئی۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں، اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے کھلا نہیں رکھتے، اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے (یہ عذاب اس دن واقع ہوگا) جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، اور ان سے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پیٹھ کو داغا جائے گا، پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو (۹/۳۴-۳۵)

زکوٰۃ کی وضعی روایات

بات کس قدر صاف اور نکھری ہوئی ہے۔ اب وہ روایت ملاحظہ فرمایئے جسے نظامِ سرمایہ داری کے جائز قرار دینے کے لئے وضع کیا گیا

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے ..... ابن عباسؓ کہتے ہیں حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا ....

(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

لیجئے! ایک وضعی روایت کی رُو سے، اکتنازِ زر شیرِ مادر کی طرح حلال قرار پا گیا اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری کے لئے پھاٹک کھل گئے۔

زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کر لی گئی، اور اس طرح بٹائی یا پٹہ کو عین مطابقِ اسلام قرار دے دیا۔ فقط اس کا نام مزارعت رکھ دیا۔

کسی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع میں شریک ہو گئے۔ اس کا نام مضاربت رکھ دیا، جو حلالؔ طیب ہے، قرآنی آیت کے الفاظ اپنی جگہ برقرار اور محفوظ رہے۔ اور وضعی روایات اور ان پر مبنی فقہ کی رُو سے وہ سب جائز پا گیا جسے ان آیات نے ناجائز حرام قرار دیا تھا۔ اقبالؒ نے اس صورتِ حالات پر اک آہِ جگرسوز کیساتھ کہا ہے!

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پا زند

اس کے بعد وہ سلطنتیں ختم ہو گئیں جن کے عہدِ اقتدار میں یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں، ان کے مملکتی آئین و قوانین نسیاً منسیا ہو گئے۔ ان کے معاشرہ کے خط و خال تک مٹا گئے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی قرآنی تحریفات جنہیں شرعی قوانین کا نام دیا گیا تھا، بدستور آگے بڑھتی گئیں اور رفتہ رفتہ عین اسلام بن گئیں۔ اس پر صدیاں گذر گئیں، اور آج تک ——— ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین ——— عصرِ حاضر میں زمانہ کے تقاضوں سے سرمایہ داری کے قصرِ کہن میں کچھ تزلزل کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تو علامہ اقبالؒ کی کچھ ڈھارس بندھی کہ یہ کابوس سینۂ انسانیت سے اتر گیا تو قرآن کے معاشی نظام کے لئے راہ ہموار ہو جائیگی۔ یہی وہ احساسات تھے جن سے کیف انداز ہو کر انہوں نے اپنی مشہور مثنوی ——— ساقی نامہ ——— میں جھوم جھوم کر کہا تھا:۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

لہ خدا کا حکم، رسول اللہؐ کی لسانِ مبارک سے، اور صحابہؓ پر گراں گذرے! (معاذ اللہ!)

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

عجمی اسلام

لیکن ان دیدہ ور آفرینیوں میں جب ان کی نگاہ ملتِ اسلامیہ پر پڑتی تو ان کی امیدیں، مایوسیوں میں بدل گئیں۔ انہوں نے بصد حسرت و یاس، انتہائی غم و الم کے عالم میں کہا۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک سب سے بڑا جہاد یہ قرار دیا گیا کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کے خلاف ایک لفظ بھی کہا، انہوں نے اسے کمیونسٹ قرار دے کر، کفر و الحاد کے فتوؤں سے نواز دیا۔ مغرب کی سرمایہ پرستانہ اقوام کے لئے ان کا یہ اسلام بڑا سازگار تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کی ہمت افزائی کی اور، دامے، درمے قدمے قلمے اس اسلام کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ انہی اقوام کے نمائندہ ابلیس کے مشیروں نے کہا تھا کہ

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و ملّا، ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

اور خود ابلیس نے، یہ کہہ کر، انہیں اطمینان دلایا تھا۔

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

آپ کو یاد ہو گا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے، امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

دنیا کے خدا پرستو! آؤ۔ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں

امریکہ اور مودودی مرحوم

ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس دعوت پہ لبیک کس طرح کہا گیا اس کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو

روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا۔
امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر، ڈاکٹر ویلر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت کی۔ ان کے ساتھ جماعتِ اسلامی، لاہور کے راہنما بھی تھے۔ اور مقامی امیر، مولانا گلزار احمد بھی۔
(بحوالہ امروز، یکم دسمبر ۱۹۷۶ء)

اس کے بعد جب ۱۹۵۵ء میں حکومتِ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو (مرحوم) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کراچی اور لاہور میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا:۔

اگر یہ امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں ...... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔ (جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت ۱۷، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

ان روابط کا تو ہمیں علم نہیں کہ یہ قائم ہوئے یا نہیں اور اگر ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی۔

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

البتہ جو معاشی نظام (مرحوم) مودودی صاحب نے پیش کیا وہ خالص سرمایہ دارانہ تھا۔ اسے انہوں نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں تفصیل سے پیش کیا تھا۔ اس کے دو ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمال اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد ہی میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ بالانتفاع

کے موافق سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے بے کار کر دیا جائے۔ (مسئلہ ملکیتِ زمین، پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء، صفحہ ۵۳-۵۲)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مولیشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جسطرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں، مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے (ایضاً ۷۳-۷۲)

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

صدرِ پاکستان نے بھی بھارت کے جریدہ "سنڈے" کو ایک انٹرویو کے دوران فرمایا تھا کہ

اسلام کی رُو سے ایک شخص جس قدر جی چاہے دولت جمع کر سکتا ہے۔ بس اس پر اسے ٹیکس ادا کرنا ہو گا۔ (طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۲)

اس سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پنجاب زکوٰۃ کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام مساوات کا دین ہے اس لئے فضل الحق کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں، ضیاء الحق صاحب کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن کی طرف توجہ دیجئے، قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے اور ہمارا یہ دین ایمان ہے کہ اسلام کی روح قرآن اور سنت رسولؐ میں ہے تو آپ یہ بتایئے کہ اگر مساوات کا مسئلہ قرآن کے نظریہ کے اندر یہ ہوتا کہ کوئی غریب نہیں ہو گا، کوئی مسکین نہیں ہو گا تو پھر قرآن میں اس کا ذکر کیوں آیا ہے۔ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخیّر حضرات سے کہا ہے کہ اپنے اموال میں سے ایک مقررہ رقم ان لوگوں کو دیں جو اس کے مستحق ہیں۔ (الاعتصام ۹ جولائی ۱۹۸۲ء)

ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ یہ اسلام، حضرت علامہ کے سامنے تھا۔ انہوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ ایک خطہ زمین حاصل کیا جائے جس میں ایسا قرآنی نظام متشکل ہو سکے

اقبالؒ کی انقلاب آفرینی

جس میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی ہو اور اسطرح امت ملوکیت، آمریت، سرمایہ داری اور تھیاکریسی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے اس کے لئے انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کو پیش کرنے کے بعد وہ برابر پکارتے رہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی، باقی بُتانِ آزری

اَلاَرضُ للّٰہ کے انقلابی نعرہ سے وہ نظامِ زمینداری کے قصرِ تعیش میں تزلزل پیدا کرتے رہے۔ وہ سرمایہ داروں کو براہِ راست مخاطب کر کے کہتے رہے کہ

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار — عیش کا پُتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار

حکمِ حق ہے لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار!

(بانگ درا صفحہ ۲۲۵)

سرمایہ داروں کو وارننگ

جب زمامِ تحریکِ پاکستان، قائداعظمؒ کے ہاتھ میں آئی، تو انہوں نے بھی زمینداروں اور سرمایہ داروں کو للکار کر کہہ دیا کہ پاکستان میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن واقعہ دہلی (۱۹۴۳ء) میں پوری شدت کے ساتھ کہا۔

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز، ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست

کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں، خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؛ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے!

پاکستان میں

آمریت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ان انقلاب آفرین غلغلوں اور طنطنوں کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن قوم کی بدقسمتی کہ جب یہ ذرا ابھرا تو اس وقت نہ وہ متکلمِ اعظم (اقبالؒ) موجود تھا، نہ قائدِ اعظمؒ۔ اور (اقبالؒ کے الفاظ میں) شاہین کا یہ نشیمن، زاغوں کے تصرف میں چلا گیا۔ یہاں آمریت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے عفاریت نے ہجوم کر کے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور ربٰو کا طوفان، بالخصوص، سیلاب کی طرح امنڈ آیا۔ قرآن کریم نے قارون کو، نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ یہودی تھا، اور یہودی اسی نظام کے سہارے زندہ چلے آ رہے ہیں۔ ان کی

یہودی نظام بینکاری

مملکت چھن گئی۔ حکومت باقی نہ رہی۔ کوئی وطن نہ رہا۔ وہ دنیا میں خانماں خراب، صحرا نوردوں کی طرح سرگرداں پھرتے رہے۔ ایں سو ماندہ و آں سو رہ ماندہ۔ لیکن انہوں نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو اس قدر محکم بنیادوں پر استوار رکھا کہ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں ان کی دست نگر ہیں، اور اس حد تک کہ ان کی سیاست بھی انہی کے اشاروں پر چلتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ــــ فرنگ کی رگِ جاں، پنجۂ یہود میں ہے۔ انہوں نے اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہا تھا کہ:

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار   جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح   دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

یہودیوں نے ساری دنیا میں بنکوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ بنکوں کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ روپیہ محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہیں، لیکن وہ درحقیقت ربٰو کا عالمگیر نظام ہے جس کے اثرات بڑے دور رس ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی نگۂ حقیقت شناس نے بہت

پہلے بھانپ لیا تھا کہ

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است　　پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک، ایں فکرِ چالاکِ یہود　　نورِ حق از سینۂ آدم ربود (پس چہ باید کرد)

یہ اس لئے کہ بینکوں کا سارا کاروبار ربوٰ کے سر پہ چلتا ہے اور ربوٰ وہ ابلیسی نظام ہے جس سے سینۂ آدم نورِ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے حرام اور خدا و رسولؐ کے خلاف بغاوت اسی لئے قرار دیا ہے کہ اس سے محفلِ انسانیت کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ دین کا سارا مدار اکلِ حلال پہ ہے۔ اور ربوٰ کے نظام میں اکلِ حلال کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑی شدت سے واشگاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تا ندانی نکتۂ اکلِ حلال　　بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ! یورپ زیں مقام آگاہ نیست　　چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام　　حکمتش خام است و کارش ناتمام

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

(مثنوی۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق)

آپ ربوٰ یعنی سرمایہ داری کے نظام کی تخریب کاری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (حضرت علامہؒ کے الفاظ میں) اس میں دین تو ایک طرف، تہذیب و دانش تک باقی نہیں رہتے۔

علامہ اقبالؒ نے یہ وارننگ اقوامِ یورپ کو دی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جس اسلامی مملکت کا خواب وہ دیکھ رہے ہیں، اس میں یہ تباہ کن کاروبار ان سے بھی زیادہ شدت سے پھیلے گا۔ بینکاری کا سودی نظام تشکیلِ پاکستان سے پہلے بھی اس برصغیر میں کارفرما تھا لیکن محدود پیمانے پہ۔ پاکستان میں یہ پھیلتا چلا گیا اور اب ملک گیر ہو رہا ہے۔ انگریز کے کافرانہ دورِ حکومت میں سود کو سود (INTEREST)

سود نہیں منافع

کہا جاتا تھا، لیکن مسلمان عوام کے دل میں سود کے لفظ سے تکدر پیدا ہوتا تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ اسے سود نہیں بلکہ منافع (PROFIT) کہا جائے۔ اس طرح (ایک لفظ کی تبدیلی سے) خدا کے حرام کردہ کو حلال کر لیا۔ موجودہ حکومت چونکہ اسلامی ہونے کی مدعی ہے، اس لئے اسے اس تبدیلی کے لئے شرعی سند کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ پاکستان میں اقامتِ دین کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے

فتویٰ صادر فرما دیا کہ

روپیہ جمع کرنے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے منصوبے تیار کریں گے، جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حقدار ہوں گے
(الیشیا ۵ نومبر ۱۹۷۸ء بحوالہ طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۹ء)

آپ کو غالباً علم ہوگا کہ بینک نہ کوئی اپنے تجارتی منصوبے تیار کرتا ہے، نہ خود کاروبار کرتا ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ لوگوں سے کم شرح سود پر روپیہ لے کر، اسے کاروباری لوگوں کو زیادہ شرح سود پر قرض دے دیتا ہے۔ ان سے جو سود وصول ہوتا ہے۔ اس میں سے (زائد حصہ) خود رکھ لیتا ہے اور باقی روپیہ جمع کرانے والوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ خالص سودی کاروبار ہوتا ہے۔

غنیمت ہے کہ ہمارے مذہبی حلقوں سے بھی اب یہ آواز بلند ہونی شروع ہو گئی ہے کہ بینک کا منافع ہر شکل میں سود ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، ہفت روزہ الاعتصام میں ایک مقالہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت ۲ مارچ ۱۹۸۴ء میں تحریر ہے۔

یہ منافع نہیں سود ہی ہے

بعض لوگ بنک کے نظام کو سودی نہیں، بلکہ تجارتی منافع پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ادھر نصف صدی کے اندر اس موضوع پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں بھی اتنا لٹریچر آگیا ہے کہ مزید اضافے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے اور علماء حقانی کی کثیر تعداد نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سود ہی ہے۔ منافع نہیں اور اب اسی پر سارے عالم کے تقریباً تمام اہلِ حق کا اتفاق ہے۔

بایں ہمہ ہماری "اسلامی مملکت" اسے منافع قرار دیتی ہے، سود نہیں۔ اس کاروبار کو مزید "اسلامیانے کے لئے" دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام رکھا ہے "بلاسود بینکاری" اور دوسرے کو کہا گیا ہے "باسود بینکاری" یہ بھی صرف الفاظ کا فرق ہے۔ دونوں کا مدار سود پر ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ باسود بینکاری میں شرح سود پہلے سے متعین کر دی جاتی ہے، اور بلاسود بینکاری میں اس شرح کا تعین منافع (یعنی سود) تقسیم کرتے وقت کیا جاتا ہے۔

ربوٰ سے زکوٰۃ اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ باسود بینکاری کی مجموعی رقم (یعنی روپیہ جمع کرانے والے کے اصل زر اور منافع کی مجموعی رقم) سے

اڑھائی فیصد وضع کر لیا اور اس کا نام زکوٰۃ رکھ دیا! ویسے تو خود لفظ زکوٰۃ کے معنی پاکیزہ نشو و نما کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر اس کی مزید وضاحت کر دی: یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ...... (۲/۲۶۷) "اے جماعت مومنین (خدا کی راہ میں) اپنی پاکیزہ کمائی خرچ کرو" اس لئے کہ لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ (۵/۱۰۰) "خبیث اور طیب کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے"۔ یہاں یہی نہیں ہوا کہ خبیث و طیب کو باہم گڈ مڈ کر دیا گیا، بلکہ اس آمیزش کے بعد جو رقم وضع کی گئی، اسے زکوٰۃ قرار دے دیا۔ اس زکوٰۃ میں دینی مدارس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے حضرات "علماء کرام" میں سے کوئی اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے جھولیاں پھیلا پھیلا کر وصول کرتے ہیں۔

تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا   کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لیکن اس طرح زکوٰۃ وصول کرنے سے بھی مسئلہ کا حقہ حل نہیں ہوا۔ چنانچہ صدر مملکت نے کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

زکوٰۃ کے نظام اور حدود کے نفاذ سے اچھے نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔ اگرچہ بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ زکوٰۃ کی رقم (۳۳۳) کروڑ روپے وصول ہوئی ہے لیکن گداگروں کی فوج ابھی موجود ہے۔ بیواؤں کی بڑی تعداد امداد سے محروم ہے۔   (جنگ لاہور۔ ۱۱ مارچ ۱۹۸۴ء)

لیکن وزیر خزانہ محترم غلام اسحٰق خان صاحب نے اعتراف کر لیا ہے کہ بینک کا منافع بھی سود ہے۔ انہوں نے پاکستان سوسائٹی آف ڈویلپمنٹ اکاؤنٹنٹس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

سود کو ختم کرنے کی پوری کوششیں کی جا رہی ہیں جب کہ سود کی جگہ منافع کو لے آنا بھی جدید سرمایہ دارانہ طریقہ ہے اور قطعی طور پر اسلامی نہیں ہے۔ اس لئے ہم سرمایہ داری کو جدید سرمایہ داری سے بدلنا نہیں چاہتے۔

(روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۸۴ء)

عمر ہا در انتظار کہ این ہم غنیمت است لیکن سود کا خاتمہ کرنے کے لئے سارا نظام سرمایہ داری بدلنا ہوگا کہ اس کے بغیر سود کا خاتمہ ہو نہیں سکتا۔

سود خوروں کے شرعی حیلے

انگریز کے کافرانہ نظام تک ہمارے ہاں "سود خور" کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا "سود خور" سے مراد ہوتی تھی نجی قرضوں پر سود لینے والا۔ یہ کاروبار ہندو بنیا کیا کرتا تھا۔ مسلمانوں میں ایک

خاص ٹائپ کے پٹھان (بالخصوص بہبئی وغیرہ کے علاقہ میں) اس کے لئے بدنام تھے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے قرضے، بینکاری یا سیونگز اسکیموں کے دائرۂ کار میں نہیں آتے، اس لئے ان قرضوں پر منافع کو بہرحال سود سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے مفتیانِ عظام نے ایسے شرعی حیلے بتا دیئے جن سے یہ حرام بھی حلال ہو جائے۔ مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری (ایم اے اسلامک لاء) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "معاشیاتِ نظامِ مصطفیٰ"۔ اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے، اور اس کے بعد ایسے حیلے درج کئے گئے ہیں جن کی رُو سے سود لیا بھی جائے اور اس کا گناہ بھی نہ ہو۔ ایک آدھ حیلہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

پہلی تدبیر

ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر، اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید کرے، اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدتِ معینہ کے لئے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ اس مدت کے بعد قرض لینے والا، قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے۔

اس فقہی حیلے سے زائد دو روپے حلال و طیب قرار پا جائیں گے۔

اس قسم کی کئی ایک تدابیر، اس کتاب میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

امام ابو یوسفؒ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہو گا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔

(بحوالہ: فتویٰ قاضی خاں مع عالمگیری۔ جلد دوم صـ ۲۷۹/۲۸۰ حصری)

اور خود صاحبِ کتاب کہتے ہیں:۔

لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔ افسوس، صد افسوس کہ شاہین نہ بنا تو۔ دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۳-۲۲)

اب آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب (مرحوم) نے کیوں کہا تھا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے!

قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری (ربوٰا) کو حرام قرار دیا تھا، کیونکہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ

آں یکے تخمے بر اُفشاند دیگرے گیرد دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

کھیتی کسی کی ہے۔ اس میں مویشی کسی اور کے چرتے ہیں۔ کاشت کوئی کرتا ہے، پیداوار کوئی اور لے جاتا ہے۔

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

اس میں، مفلسوں، ضعیفوں کے ہاتھ سے روٹی چھین لینا۔ یعنی ان کے جسم ناتواں سے جان کشید کر لینا کاریگری کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کہا تھا کہ

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جب تک یہ نظام تہ و بالا نہ ہوگا، دین تو ایک طرف، عقل و خرد، تہذیب و تمدن تک باقی نہیں رہیں گے یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ قرآن کریم نے اس نظام کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ جس مسلک یا شعار کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ کوئی آمرانہ آرڈیننس نہیں ہوتا۔ وہ سراسر علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے نظامِ ربوٰا مسلمانوں کے لئے اس لئے حرام قرار دیا کہ اس سے ان کا دین باقی نہیں رہتا۔ لیکن دیگر نوعِ انسان سے کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ نظام دشمنِ تہذیب و دانش ہے۔ اس سے تم سطحِ انسانیت سے نیچے گر جاؤ گے۔ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نظام کو حرام قرار دیا ہے، اسے حرام سمجھا جائے۔

گر جہاں داند حرامش را حرام تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

دوام اور پائندگی قرآن کے معاشی نظام ہی کو حاصل ہوگی کیونکہ اس میں تہذیب و دانش پروان چڑھیں گے۔ ان تنذیرات و تصریحات کے بعد علامہ نے اس کی وضاحت کر دی

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر با نگاہے دیگرے او را نگر

نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر قرآن کا نظام قائم کرنا، مذہبی پیشوائیت کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ یہ خود دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کا نظام تو یہ تھا کہ

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

لیکن

مکتب و ملا سخن ہا ساختند مومناں ایں نکتہ را نشناختند

زندہ قومے بود از تاویل مرد آتش او در ضمیر او فسرد

مذہبی پیشوائیت یہ نہیں ہونے دیگی

نکتۂ شرعِ مبیں یہ تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نے قرآنِ حکیم کے اس اصل الاصول کو اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ یہ سر تا پا حرکت و حرارت قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ یہ سب دین فروش ہیں۔ قرآن حکیم نے کہا تھا کہ ان کا شیوہ یہ ہے کہ

یَکْتُبُوْنَ الْکِتَابَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ وہ ارشاداتِ خداوندی ہیں۔" یہ سب اس لئے کہ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ـــــ تاکہ اس سے چار پیسے کمائے جائیں۔" اور وہ نہیں جانتے کہ فَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْھِمْ وَوَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ (۲/۷۹)
" ان کے یہ فتاویٰ اور ان کے ذریعے حاصل کردہ روٹی انہیں لے ڈوبے گی۔"

اس سے؛

عقل و نقل اُفتاد در بند ہوس　　منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس

یہ منقولی بات کہیں یا معقولی، مقصد ان کا اپنی مفاد پرستی ہوتا ہے۔ ان کا منبر، روٹے بیچنے والے کا خوانچہ بن کر رہ گیا ہے۔

زیں کلیماں نیست امید کشود　　آستیں ہائے یدِ بیضا، چہ سُود؟

یہ وہ صاحبانِ ضربِ کلیم نہیں جن کا ثعبانِ مبین، فرعون، ہامان و قارون کو ہڑپ کر جائے۔ ان کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں میں ایمان کی شمعیں نہیں۔ لہٰذا ان سے کشودِ کار کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

یہ تھے وہ ساحرین و سامرین جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے حضرت علامہؒ نے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصور دیا تھا۔ تاکہ امّتِ مرحومہ کو حلال کی روٹی مِل سکے۔ اگر وہ جانتے کہ اس مملکت کا یہ حشر ہونا ہے، تو وہ کبھی اپنے نالۂ نیم شبی اور فغانِ سحری کو اس کے لئے وقف نہ کرتے۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ:-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے، لیکن اس آزادی سے یہ مطلب نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے ...... اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا۔ جس کی بنیاد بھی انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟

کہا جاتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اس دور کا اقتصادی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں[1] اگر یہی بات ہے تو اسے اختیار کئے رہیئے، لیکن اسے حرام تو سمجھئے۔ قرآن کے معاشی نظام

۱۔ اس کے بغیر چارہ [illegible]

کے بجائے اسے اختیار کرنے سے جو حشر باقی دنیا کا ہوگا، وہی ہمارا بھی ہوگا۔ لیکن اس کے اسلامی قرار دینے سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ یہی وہ جرمِ عظیم تھا جس کے احساس سے علامہؒ نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ کہا تھا ؎

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو! از درودِ خود میالا نامِ اوؐ!

ہماری وجہ سے اگر اسمِ محمدؐ پر کوئی حرف آگیا تو یہ جرم ناقابلِ معافی ہوگا جو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ دین کا نظام اختیار نہ کرنے سے جو حشر باقی قوموں کا ہوگا وہی ہمارا ہوگا۔ لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ ہمارا حشر ان قوموں سے بھی زیادہ اندوہناک اور عبرت آموز ہوگا۔ سیکولر قوموں کی کیفیت یہ ہے کہ جو معاملہ ان کے سامنے آتا ہے وہ عقل و فکر کی رُو سے اس پر غور کرتی ہیں۔ علم و آگہی کی روشنی میں اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیتی ہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے ترازو میں رکھ کر اسے تولتی ہیں۔ اور اس کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچتی ہیں۔ جب تجربہ بتاتا ہے کہ اس فیصلہ میں کوئی سقم رہ گیا ہے تو وہ اس پر نظرِ ثانی کرتی ہیں۔ اور اس طرح دانش و بینش کے ہم رکاب زندگی کا سفر طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے برعکس، ہماری حالت یہ ہے کہ جونہی کوئی معاملہ ہمارے سامنے آئے، اُدھر سے آواز آجاتی ہے کہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ (بغیر بتائے کہ اس کی اتھارٹی کیا ہے)۔ اس آواز کے ساتھ ہی عقل و فکر کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔ علم و شعور کے دروازے مقفل ہو جاتے ہیں۔ دماغوں پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں تو آپ پر کفر و الحاد حتیٰ کہ ارتداد تک کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ آپ کو ان کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔ اس باب میں افراد ہی نہیں، حکومتیں بھی بے بس ہوتی ہیں۔ وہ اعتراف کرتی ہیں کہ فلاں (شرعی) قانون ناممکن العمل ہے لیکن وہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف اس میں کسی قسم کا ردوبدل بھی نہیں کر سکتیں۔ اس کی زندہ مثالیں خود ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں، شدید جذباتی واقع ہوئے ہیں، تو اس کی وجہ یہی ہے۔ جس قوم پر صدیوں سے علم و عقل سے کام لینا حرام قرار دے دیا گیا ہو، جس کا غور و فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو، وہ جذباتی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی؟ اور عقل و فکر سے عاری، جذباتی قوموں کا جو حشر ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے۔ اس کی زندہ مثال ہم خود ہیں۔ اقبالؒ ساری عمر یہی رونا روتا رہا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ،

داستانِ او مپرس از منؔ، کہ من چوں بگویم، آنچہ ناید در سخن

اور یہی کہتا خود میں بھی چلا جاؤں گا۔ والسلام

صدرِ مملکت کی تقاریر

پشاور کے جلسہ عام میں ان کی تقریر، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۳ مارچ ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں اسطرح شائع ہوئی

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اس امر کا قطعی اعلان کیا ہے کہ آئندہ انتخابات اسلامی شریعت کے تحت منعقد ہوں گے۔ انہوں نے ایسے افراد جو اللہ تعالیٰ کے احکامات اور شعائر کی پابندی نہیں کرتے کو انتباہ کیا کہ انہیں ووٹر کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جائے گا اسی طرح ملک دشمن اور سماج دشمن سرگرمیوں میں ملوث بھی ووٹ ڈالنے کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔ وہ آج یہاں پشاور میں ایک تاریخی جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے، جس میں مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے تقریباً دو لاکھ افراد نے شرکت کی۔ صدر نے کہا کہ انتظامیہ، عوامی نمائندگی اور مستقبل کی اسمبلیوں میں بدعنوان اور مجرموں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ صدر نے تالیوں کی گونج اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں سمگلنگ، چوری، شراب نوشی، قمار بازی اور ایسی ہی دوسری غیر صحت مند سرگرمیوں میں ملوث افراد کو تنبیہ کی کہ وہ انتخابات سے قبل اپنی اصلاح کر لیں ورنہ وہ انتخابات کے لئے نااہل قرار دے دیئے جائیں گے اور انہیں ووٹ ڈالنے کی اجازت نہیں ہوگی، صدر نے آئندہ انتخابات کے لئے تیرہ اہم راہنما اصول بیان کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ انتخابات قطعی طور پر اسلامی شریعت کے مطابق ہوں گے اور حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ سربراہ مملکت انتظامیہ اور منتخب عوامی نمائندے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ آئین میں تمام نظریاتی اختلافات ختم کر دیئے جائیں گے۔ ہر شہری کے لئے سیاست، اقتصادیات اور طریق حیات غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں اسلام ہی سرچشمہ ہدایت ہوگا۔ صدر نے کہا کہ آئندہ ہمارے مستقبل کے طرزِ حکومت میں حقیقی اسلامی مساوات کا دور دورہ ہوگا۔ صدر نے کہا ہمارا ایمان ہے کہ کسی بھی شہری کے درمیان دینوی مرتبہ اور حیثیت کے اعتبار اور امتیاز کی وجہ سے کوئی فرق نہیں ہے اور سیاست میں بھی لفظی اور معنوی طور پر اس اصول کی پابندی کی جائے گی اور ہر شخص کی عزت اور احترام اس کی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر کیا جائے گا نہ کہ اس کی سماجی حیثیت کی وجہ سے۔

صدر نے اعلان کیا کہ آئندہ انتخابات قطعی طور پر سیاسی اجارہ داریوں سے پاک ہوں گے اور یہ حقیقی اسلامی یکجہتی کے غماز ہوں گے۔ صدر نے کہا کہ آئندہ طرزِ انتخابات، اہلیت اور مشاورت کی بنیاد پر وضع کیا جائے گا۔ قوانین میں اس طور پر ترمیم کی جائے گی کہ سماج دشمنوں اور نام نہاد سیاسی لیڈروں کے لئے نئے نظام میں کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ صدر نے کہا کہ انتخابات کے قوانین

ایسے بنائے جائیں گے کہ "مڈل کلاس" (درمیانہ طبقہ) اور دانشوروں کی ملکی امور میں واجبی شرکت ہو سکے۔ جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ پاکستان کے ایک سچے محب اور اقتدار کے امین کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس امر کو یقینی بنائیں کہ مستقبل کی سیاست ایسے منفی عناصر کے ہاتھ میں نہ جائے جو علاقائیت کی آواز اٹھاتے اور کنفیڈریشن وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں۔ صدر نے کہا جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں انہیں آئندہ اسلامی طرزِ حکومت میں واجبی عزت و توقیر دی جائے گی۔ صدر نے کہا کہ وہ اپنے لئے اقتدار کے خواہاں نہیں بلکہ وہ اللہ اور اس کے حقیقی پیروکاروں کی حاکمیت کے قائل ہیں۔ صدر نے کہا کہ وہ پشاور کے عوام کے ذریعے سے پوری قوم سے اپیل کر رہے ہیں کہ وہ معاشرے کو اسلامی شعائر کے مطابق ڈھالنے کے مقدس کام میں ان کے ساتھ بھرپور تعاون کریں۔ صدر نے کہا کہ ملک میں حقیقی جمہوریت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شخص کو سربراہ مملکت سے جواب طلبی کا حق ہوگا حتیٰ کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ سربراہ مملکت اسلامی شریعت کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ اپنی تلوار بھی سونت سکتا ہے۔

انہوں نے خلفائے راشدین کے وقت ایک واقعہ کا ذکر کیا جب کہ ایک عام آدمی کو اس بات کا بھی جواب دیا گیا کہ مال غنیمت سے ملنے والے اس کپڑے سے خلیفۂ وقت نے اپنی قمیض کیسے تیار کر لی ہے جب کہ دوسرے مجاہدین کو ملنے والا کپڑا کم تھا۔ صدر نے کہا کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے مغربی جمہوریت کے نقائص دیکھ لئے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ہمارے تقاضوں پر ہرگز پورا نہیں اترتا۔ صدر نے کہا کہ ہم خالصتاً ایک نیا پودا لگائیں گے جو ہر لحاظ سے نیا ہوگا۔ صدر نے کہا کہ ہمیں یہ امید ہے کہ اسلامی یکجہتی اور استحکام کے لئے یہ پودا جلد پھلے پھولے گا۔ صدر نے کہا کہ جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس میں ہر شعبہ زندگی کے لئے مکمل راہنمائی اور ہدایت موجود ہے تو پھر ہمیں اپنے مقصد میں ناکامی کا خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ملک میں جمہوریت کی بحالی کا تعلق ہے صدر نے کہا ان کے نزدیک یہ تصور سراسر غلط ہے کیونکہ یہاں ماضی میں کبھی جمہوریت کو پنپنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ صدر نے کہا کہ ہمارے ملک کے عوام پر جمہوریت کے نام سے بدترین آمریتیں مسلط رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے ملکی امور میں معقولیت کو متعارف کرایا ہے اگرچہ یہ مارشل کہلاتا ہے۔ صدر نے کہا اب ہمارا دعویٰ ملک میں حقیقی اسلامی جمہوریت کے نفاذ کا ہے اور ہم اسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے انشاء اللہ ثابت کر دیں گے۔

صدر نے کہا کہ انتخابات کے انعقاد سے کچھ وقت قبل عام انتخابات کے پروگرام کا اعلان کر دیا جائیگا اور کنوینسنگ کے لئے بہت کم وقت دیا جائے گا۔ صدر نے صاف الفاظ میں کہا کہ وہ اپنے الیکشن کے پروگرام کے بارے میں اس وقت بھی کچھ کہنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ وہ قبل ازیں اپنے دو اعلانات میں بیان کردہ پروگراموں کو پورا نہیں کر سکے۔ تاہم یہ انتخابی پروگرام ان ہی لوگوں کی درخواست پر

ملتوی کئے گئے جواب ملک میں انتخابات کے انعقاد کے لئے شور مچا رہے ہیں۔ صدر نے کہا کہ ہم طاقت اور اقتدار ایسے لوگوں کے حوالے کرنے کا فخر حاصل کریں گے۔ جو اس کے اہل ہوں گے۔ صدر نے کہا کہ ہم حقیقی اسلامی قیادت فراہم کرنے کا وعدہ پورا کر دیں گے۔

صدر نے کہا یہ درست ہے کہ اب تک ہم اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکے لیکن اب ہم قوم کی امنگوں کے مطابق آئندہ انتخابات کے ذریعے اسلام کے سچے خادم مہیا کریں گے۔ صدر نے ہر شعبہ زندگی میں اسلامی اقدار پر عمل کرنے اور قائداعظمؒ کے ارشاد اتحاد، ایمان اور تنظیم سے راہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ صدر نے کہا کہ ہم اسلامی نظام عدل کو اولیت دیتے ہیں اور ہم نے مالاکنڈ ڈویژن میں قاضی عدالتوں کے قیام کا بھی فیصلہ کیا ہے تاکہ اس صوبے (سرحد) کو جو اسلامی روایات اور تعلیمات سے حقیقی محبت رکھتا ہے۔ عدلیہ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے پہلی بنیاد بنایا جائے۔

صدر نے کہا کہ پاکستان میں انتخابات ضرور ہوں گے۔ نمائندے منتخب ہو کر آئیں گے پارلیمنٹ مجلس شوریٰ بنائیں گے۔ نمائندہ اسلامی حکومت قائم ہو گی۔ اس کام کے لئے میری کوئی شرائط نہیں تاہم میری کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ صدر نے کہا کہ ہم ایسے انتخابات کے حق میں نہیں جو ملک کی جڑیں مضبوط کرنے کی بجائے انہیں ہلا کر رکھ دیں۔ ہمیں ایسی جمہوری حکومت کی بھی ضرورت نہیں جو ملک و قوم کو اسلامی مقاصد سے ہٹ کر کہیں اور لے جائے۔ صدر نے کہا کہ بعض لوگ بار بار پوچھتے ہیں کہ الیکشن شیڈول کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے۔ میں ان کو جواب دیتا ہوں کہ ہم وقت سے پہلے ہرگز کسی چیز کا اعلان نہیں کریں گے۔ صدر نے کہا کہ ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد میں نے الیکشن کے وقت کا تعین کر دیا مگر وقت پر الیکشن نہ ہو سکے اس طرح ۱۹۷۹ء میں ۶ ماہ قبل انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا مگر پھر بھی یہ منعقد نہ ہو سکے۔ صدر نے کہا کہ انتخابی مہم کے دوران افراتفری کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ نظریہ پاکستان کے خلاف بیان بازی ممنوع ہو گی۔ امیدواروں کی بنیادی شرائط کا اعلان کیا جائے گا۔

صدر نے کہا کہ ہم اسلامی جمہوریت کی بنیاد رکھ کر اقتدار سے علیحدہ ہوں گے انہوں نے کہا کہ جب ۱۴۰۰ سال سے ہم یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے تو کیا اس میں طرز حکومت کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس سال پاکستان میں اسلامی طرز حکومت کی بنیاد رکھ دیں گے۔ آپ دعا کریں کہ خدا ہمیں کامیاب کرے۔ صدر نے کہا کہ مارچ کوئی ڈیڈ لائن نہیں، اس وقت تک ہم ۱۴ اگست کے طے شدہ پروگرام کے مطابق اقدامات مکمل کر لیں گے۔ صدر نے واضح کیا کہ یہ قوم کے لئے نہایت اہم وقت ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم سب ذمہ دارانہ رویہ اپنا کر ملک و قوم کو اسلامی جمہوریت کی منزل تک پہنچا دیں۔ صدر نے کہا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو بلند مقام دیا جائے گا۔

صدر نے کہا کہ انتخابی عمل اس سال شروع ہوگا اور آئندہ سال مارچ تک ختم ہو جائے گا۔ صدر نے تالپوروں کی گڑھی میں اعلان کیا کہ سیاسی قیادت غنڈوں، ملک دشمنوں اور اسلام مخالف طاقتوں کی بجائے متوسط، شریف اور دانشور طبقے کو حاصل ہوگی، صدر نے اپنی تقریر میں سرحد کے عوام کے تاریخی کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تحریکِ خلافت اور تحریک پاکستان میں سرحد کے عوام ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں سرحد کے عوام نے ریفرنڈم کے ذریعے قیام پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ جنگ کشمیر میں نمایاں حصہ لیا صدر نے کہا کہ ہمارے سرحد کے بھائیوں نے افغان مہاجرین کی دیکھ بھال کر کے انصار مدینہ کی روایت تازہ کی ہے اس پر نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پورا عالم اسلام نازاں ہے۔ صدر نے کہا کہ آپ کا یہ کردار اسلام کی روایات کے عین مطابق ہے۔

نمائندہ "جنگ" کے مطابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے کہا کہ ملک میں آئندہ انتخابات شریعت اسلامی کے عین مطابق ہوں گے اور اس مقصد کے لئے ملک میں دستوری اور آئینی طور پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے گی، انتظامیہ بشمول صدر اور تمام منتخب شدہ افراد اللہ اور رسولؐ کے تابع ہوں گے آئین کے تمام تر فکری تضادات ختم کر دیئے جائیں گے، اسلام ہمارا دین سیاست اور معیشت ہوگا اسلام پاکستان کے ہر شہری کا ضابطہ حیات ہوگا، پاکستان میں انشاء اللہ صحیح طور پر اسلامی مساوات قائم ہوگی، طریقہ انتخاب کی بناء عہدہ طلبی اور مہم جوئی کی بجائے مشاورت ہوگی، انتخابی قوانین میں دور رس ترامیم کی جائیں گی۔

اس کے ساتھ صدر مملکت کی اس تقریر کے ایک حصے کو بھی شامل کر لیجئے جو انہوں نے سبی میں فرمائی تھی اور جو جنگ (لاہور) کی اشاعت بابت یکم مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا:

> اسلام نہیں یہ نہیں کہتا کہ صدارتی نظام یا بادشاہت یا پارلیمانی نظام اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اپنے حالات کے مطابق نظامِ حکومت اختیار کیا جائے۔ اس کے لئے ہم جو نظام اپنے حالات کے مطابق چاہیں اختیار کر سکتے ہیں

پھر انہوں نے نمائندہ جنگ کو واشنگٹن میں انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا

> جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن حکیم آپ کو یہ نہیں بتاتا کہ آپ صدارتی طرزِ حکومت رکھیں یا پارلیمانی طرزِ حکومت نہ رکھیں۔ آپ بادشاہت رکھیں یا نہ رکھیں اسلام یہ نہیں کہتا بلکہ بنیادی اصول دیتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ خدا کے پاس ہے۔ انسان صرف اس کے احکامات بجا لانے والا ہے۔ اس کا خادم ہے۔

(جنگ لاہور ۲۲ اپریل ۱۹۸۴ء)